سماجیات کے اُصول

(برائے۔ بی۔اے)

(آندھراپردیش کے بی۔اے۔ کے طلباء کے لیے نصابی کتاب)

مصنف
ڈاکٹر فاطمہ شجاعت

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سماجیات کے اصول

سماجیات کے اُصول

(برائے بی۔اے)

(آندھراپردیش کے بی۔اے۔ کے طلباء کے لیے نصابی کتاب)

مصنّف

ڈاکٹر فاطمہ شجاعت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل حکومت ہند

ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

Samajiyat Key Usool
by
Dr. Fatima Shujaat

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1979

دوسرا اڈیشن : 2004، تعداد: 500

قیمت : -/82

سلسلۂ مطبوعات : 1164

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی 66

طابع: فہمی کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اورحیوان میں بنیادی فرق نطق اورشعور کا ہے۔ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار ورموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات وکائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔علم کی دواساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اورظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اوراس دنیا کی تہذیب وتطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں ،سچے صوفیوں اورسنتوں اورفکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کوسنوارنے اورنکھارنے کے لئے جوکوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ظاہری علوم کاتعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل وتعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فسلفہ، سیاست اور اقتصاد،سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ وترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔اسی لئے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تولفظ کی زندگی اوراس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پرعلم وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے ،بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اورخواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اورغیر نصابی کتابیں تیارکرائی جائیں اورانھیں بہتر سے

بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔اس مقصد کے حصول کے لئے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

موضوعی فہرست

پیش عبارت ۔	11
پہلا باب : سماجیات اور سماجی علوم	13
سائنس کا مفہوم	13
سائنس کی درجہ بندی	17
طبعی یا فطری علوم : طبیعات، کیمیا، ارضیات، فلکیات	17-20
حیاتیاتی علوم : نباتیات، حیوانیات	21-22
تمدنی یا سماجی علوم :	23
سماجیات، سماجیات کی نوعیت، سماجیات کی تاریخ،	26-53
سماجیات میں تحقیق کے طریقے : مشاہدے، سوالیات، انٹرویو	
شیڈول، شماریاتی طریقے : درجہ بندی، جدول	
سماجیات اور سماجی علوم : تاریخ اور سماجیات	54-62
نفسیات اور سماجیات	
معاشیات اور سماجیات	
سیاسیات اور سماجیات	
فہرست کتب	63

دوسرا باب: سماج کی ماہیت	64
انسانی اور حیوانی سماج	72-80
حیاتی سماجی نظام	77
ممیلین سماج	77
حیوانات اعلا کا سماج	79
انسانی سماج	81-84
فہرست کتب	85
تیسرا باب: نظامِ فطرت اور انسانی سماج	86
جغرافیائی عوامل	86
حیاتیاتی عوامل	89
عُضویت اور عُضویاتی تمثیلات	90
آبادیاتی عوامل	95
آبادیات کی ابتداء	97
فرد اور سماج	101
سماج کے نظریے	104
نظریۂ معاہدہ	104
نظریۂ عُضویت	110
اجتماعی شعور کا نظریہ	113
فہرستِ کتب	116
چوتھا باب: توارث اور ماحول	117
فہرستِ کتب	127
پانچواں باب: سماجی سسٹم: سماجی تفریق اور سماجی درجہ بندی	128
سماجی رول	131

ریفرنس گروہ 133
رول کامپلیکس 134
رول اور شخصیت تضادی رول 135
حیثیت 137
سماجی درجہ بندی کے افعال 141
طبقہ 144
سماجی طبقوں کا معیار 147
ذات پات کا نظام 150
ذات کے نظریے 154
ذات پات کے نظام کی خصوصیتیں 155
ذات پات کا نظام اور سماجی تبدیلی 160
فہرستِ کتب 163

چھٹا باب: سماجی بین عمل اور سماجی طریق 164

سماجی بینِ عمل 167
سماجی بینِ عمل کی اساس 169
مفاد 175
محرک 176
سماجی طریق کی شکلیں 179
ارتباطی طریق 179
تطابق 179
تطابق کی نوعیت 181
ہم حیثیتی تطابق 181
برتر یا کمتر حیثیتی تطابق 182
تطابق کے طریقے 183

مُطابقت 186
مُطابقت کے عوامل 190
انجذاب 192
تعاون 195
غیرارتباطی طریق 198
تصادم 198
مقابلہ 201
مقابلے کے فعل 203
مقابلے کی قسمیں 204
فہرستِ کتب 206

ساتواں باب : سماجیت 207

سماجیت کی ایجنسیاں 212
خاندان 213
ہم عمر گروہ 216
درس گاہیں 217
سماجیت کے نظریے 218
درکائم کا نظریۂ اجتماعی نیابت 219
کولی کا نظریۂ آئینہ ذات 220
میڈ کا نظریۂ شعورِ ذات 223
فرائڈ کا نظریہ لاشعور، تحتِ شعور، اور شعور 226
اکتساب اور تقلید 228
فہرستِ کتب 232

پیش عبارت

موجودہ زمانے میں یہ احساس بڑی تیزی سے تقویت پا رہا ہے کہ انسان لگاتار محنت اور جستجو سے مظاہرِ فطرت پر قابو پانے میں تو کامیاب رہا ہے، لیکن جن مختلف افراد، گروہوں اور اداروں سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے اور جن کے اثرات سے اس کی شخصی، خاندانی، معاشی، سیاسی قومی اور بین الاقوامی تعلقات میں عدم مطابقت پیدا ہوتی ہے ان کی طرف سے وہ غفلت برتتا ہے۔ لہٰذا جب تک ان مختلف سماجی مظاہر کا سنجیدگی سے مطالعہ نہ کیا جائے اور اُن پر غیر جانبداری اور سائنسی نقطۂ نظر سے روشنی نہ ڈالی جائے اس وقت بہتر سماجی تعلقات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

سماجیات کا مطالعہ وقت کی اسی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے جس کی وجہ سے بدلتے ہوئے سماجی اداروں سے مطابقت کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ گو دوسرے سماجی علوم کے مقابلے میں سماجیات کی تاریخ مختصر ہے لیکن سماجی تعلقات اور سماجی بین عمل کے مطالعے کی حیثیت سے علم اور فن کے ہر شعبے میں سماجیات کے اصولوں سے مدد لی جاتی ہے تاکہ مختلف سماجی مظاہر کی نوعیت کو سمجھ کر بہتر طریقے پر مطابقت کی جا سکے۔

اسی احساس کی بنا پر موجودہ زمانے میں سماجیات کی تعلیم محض ایک مضمون اختیاری کی حیثیت سے چند جامعات کی چار دیواری تک محدود نہیں ہے بلکہ پیشہ وارانہ کالجوں جیسے میڈیکل، نرسنگ، انجینئرنگ اور سوشیل ورک میں بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے سماجیات کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے۔

کالجوں سے ہٹ کر مختلف محکموں میں بھی سماجیات سے واقفیت رکھنے والے افراد کا تقرر کیا جاتا ہے تاکہ مختلف سماجی مسئلوں کی یکسوئی میں مدد ملے۔ مختلف تنظیمی اور تدریسی اداروں کی مشاورتی کمیٹیوں میں سماجیات کے ماہرین کی خدمتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے تاکہ متعلقہ محکموں

ور اداروں کی کارکردگی میں اضافہ ہو۔ غرض زندگی کا چاہے کوئی شعبہ ہو جہاں بھی افراد ایک دوسرے سے ربط میں آتے ہیں سماجیات کی جانکاری ضروری سمجھی جاتی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں جہاں تک ممکن ہوسکا سماجیات کے نظریوں، سماجیات کے نفسِ مضمون اور سماجی مظاہر کی مختلف نوعیتوں کو آسان اور سلیس انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر باب کے آخر میں ان مروجہ معیاری کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک راست حوالوں کا تعلق ہے صفحوں کا نمبر دیا گیا ہے اور جہاں پوری کتاب کو پڑھنے کی ضرورت ہے وہاں صفحوں کا نمبر بے معنی ہے۔

میں ترقی اردو بورڈ کی ممنون ہوں کہ اس موضوع پر کتاب لکھوا کر آرٹس اور سائنس کے طالب علموں کو سماجی مظاہر، سماجی تعلقات کی نوعیت اور سماج کی ماہیت سے واقف کرانے کی ذمہ داری قبول کی، جس کی بناء پر وہ اپنے سے متعلقہ افراد اور اداروں کو بہتر طور پر سمجھ کر تفویض شدہ کام کو عمدہ طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

جناب حبیب الرحمان صاحب کی بزرگانہ شفقتوں اور جناب سری نواس لاہوٹی صاحب کے اصرار سے یہ کتاب وقت پر تیار ہوسکی جس کے لیے میں ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

کوئی بھی علمی کام اس وقت تک تشفی بخش طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ پیچیدہ علمی نکات کی تشریح میں علم دوست ساتھیوں سے تبادلۂ خیال نہ کیا جائے۔ میں اس سلسلے میں مسٹر جمیل، ڈاکٹر عمادی اور مسز رتن شاہ کی شکر گزار ہوں۔

فاطمہ شجاعت

فروری سنہ 1978ء

پہلا باب

سماجیات اور سماجی علوم

سائنس کا مفہوم:

معلومات کے مجموعہ کو بالعموم سائنس کہا جاتا ہے اور وہی معلومات جزو سائنس قرار دی جاسکتی ہیں جو صداقت پر مبنی ہوں۔ جو جامع اور مکمل ہوں۔ جن کے دلائل زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوں۔ جن کے اصولوں کا اطلاق آفاقی نوعیت کا حامل ہو۔ جن میں تنگ نظری اور تعصب کا دخل نہ ہو۔ جن کی نوعیت موضوعی (Objective) ہو۔ جن میں شخصی عنصر کا شائبہ نہ ہو اور جو انفرادی پسند اور ناپسند سے بری ہوں۔ اس لحاظ سے سائنس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سچائی، مکمل سچائی اور سچائی کے سوا کچھ نہ ہو۔ یعنی دوسرے لفظوں میں:

"The scientist must get the truth the whole truth and nothing but the truth."[1]

یہی وجہ ہے کہ جب سائنسدان کسی موضوع پر مواد (data) اکٹھا کرتا ہے تو وہ اس جستجو میں لگا رہتا ہے کہ وہ اپنے بیان کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی صحت دوسروں کے لیے قابل قبول ہو۔ وہ بار بار مشاہدے اس لیے کرتا ہے کہ نتیجے میں فرق نہ آنے پائے بلکہ وہ تصدیق کی کسوٹی پر جوں کے توں اتریں۔ غرض سائنسدان طبعی اور سماجی مظاہر کی اس طرح عکاسی کرتا ہے کہ زندگی کی تلخ حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں۔ اس کے پیش نظر کبھی بھی شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں پیش کرنا نہیں ہوتا کیونکہ حقیقت سے گریز سائنس کے منافی ہے۔ لہٰذا ایسی تمام معلومات جو محض تصورات، خیالات اور عقائد پر مبنی ہوتی ہیں وہ تفریح طبع کا باعث ضرور ہو سکتی ہیں، لیکن وہ سائنٹفک حیثیت اس لیے حاصل نہیں کر سکتیں کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ ممکن نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سائنسی

معلومات میں بھی نئی تحقیقوں کی بناء پر پُرانے نظریوں میں ردوبدل اور اضافے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس ردوبدل اور اضافے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، نگاہ دُوررس ہوتی ہے، فہم عامہ تیز ہوتی ہے اور عقل جلا پاتی ہے۔

پروفیسر ڈیوڈ ڈریسلر (Prof. David Dressler) نے سائنس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

"Science is a set of Procedures-careful and unbiased observation, replication, and falsification- that yields a body of know-ledge about the empirical world."[۶]

یعنی "سائنس ضابطوں کا مجموعہ ہے، جو محتاط اور غیر طرف دارانہ مشاہدوں پر مبنی ہے۔ جس میں باربار دُہرانے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جس میں دروغ بافی یا غلط بیانی کا دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ معلومات کا مجموعہ ہوتا ہے جس کا تعلق تجرباتی دنیا سے ہوتا ہے"۔

اس تعریف کے تین اہم جزو ہیں:

۱۔ مشاہدہ
2۔ باربار دُہرانے کی صلاحیت
3۔ غلط بیانی یا دروغ بافی

سائنس کی معلومات مشاہدہ پر مبنی ہوتی ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں غیر مشاہداتی معلومات سے سائنس میں بحث نہیں کی جاتی۔ سائنس کی یہ خصوصیت تو طبعی اور حیاتیاتی علوم میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، لیکن سماجی علوم جیسے سیاسیات، نفسیات، معاشیات، انسانیات اور سماجیات وغیرہ میں سائنس کی اس تعریف کا اطلاق مطلق معنی میں ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے طبعی اور سماجی علوم کی نوعیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی طبعی مظہر کا مشاہدہ نہ صرف ایک بار بلکہ کئی بار ممکن ہے اس کے برخلاف سماجی مظہر یعنی مذہب کے نفسِ مضمون پر غور کیجیے جس کی اساس عقائد پر ہے۔ خدا یا دیوتاؤں کا تصور، ان کی فوق فطری قوتوں اور معجزات وغیرہ کا تعلق سراسر عقائد پر مبنی ہے جہاں عقل اور منطق کا کوئی دخل نہیں۔ سماجی علوم میں عقائد سے اس لیے بحث کی جاتی ہے کہ وہ تمدن کا اہم جزو ہیں اور یہ عقائد انسانی بین عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سائنس کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ سائنسی مواد کو بار بار دُہرا کر نتیجوں کی صحت کے بارے میں یقین کیا جاسکے۔ اس لحاظ سے کسی بھی موضوع پر مواد اکٹھا کرنے کے لیے جو طریقے (Methods) اختیار کیے جاتے ہیں ان کے استعمال سے مشاہدوں اور تجربوں میں فرق نہیں آنا چاہیے۔

سائنس کی تیسری خصوصیت کے لحاظ سے نظریے، خیالات، منطق اور عوامی مفروضات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ سائنسی طریقے سے اگر وہ صحت مند ثابت نہ ہوں تو انھیں غلط ٹھہرایا جاسکے۔ مثال کے طور پر برس ہا برس سے یہ قیاس آرائی کی جاتی رہی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں منطقی طور پر نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ اس قیاس آرائی کی تردید سائنسی نقطۂ نظر سے ہو چکی ہے۔

غرض سائنسی طریقے کی وجہ سے اصلیت (facts) اور عقیدوں (beliefs)، شہادتوں (evidence ؛ اور عوامی حکمت (folk wisdom) میں فرق ممکن ہے۔ سائنسی شہادتوں اور عوامی حکومت میں امتیاز کرنے کے لیے ان عوامی نظریوں (folk wisdom) پر غور کرنا ہوگا جن کا سماج میں عمل دخل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تبت میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب کوئی شخص مرنے کے قریب ہوتا ہے تو لاما (Lama) اس کے سر کا ایک بال کھینچتا ہے تاکہ بال کی جڑ سے رُوح پرواز کر جائے۔ ترکی میں ایک مقدس ہستی کے ذریعے مرنے والے کا حلق تر کیا جاتا ہے تاکہ جب اس کی رُوح ابدیت کے زینوں پر سے گزرنے لگے تو کہیں وہ شدّتِ پیاس سے مجبور ہو کر ٹھنڈے پانی کی خاطر اپنی روح کو شیطان کے ہاتھ فروخت نہ کر دے۔ اسی قسم کے بیسیوں عقائد پر مبنی معلومات ہمیں ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی کی معلومات آفریں کتاب "ہندوستان کے آدی باسی" سے حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ناگاؤں کے عقیدوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے ہاں دوسرے گانو سے انسانی سر کاٹ کر لانے سے ان کے گانو میں انسانوں اور مویشیوں کی تعداد اور فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ممکن ہے ان کا عقیدہ ہے کہ فصلوں کی پیداوار ایسی صورت میں اور بھی زیادہ بڑھتی ہے جب کہ لمبے لمبے بالوں والی عورت کا سر کاٹ کر لایا گیا ہو[3]

یہ عوامی نظریے عقیدوں اور روایتوں میں اس قدر گُتھے ہوتے ہیں کہ انسان انھیں جُوں کے توں قبول کر لیتا ہے کبھی وہ استدلالی اور عقلی طور پر ان کا جواز ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف سائنس عقیدوں اور روایتوں کو پسِ پشت ڈال کر ہر واقعہ کا تجزیہ کرتی ہے اور مشاہداتی شہادتوں (observed evidence) کی بنا پر ان کی توجیہہ اور وضاحت ہے۔

بالعموم سماجی علوم کے ماہر اور بالخصوص سماجیات کے ماہران عوامی نظریوں میں اس لیے دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کا اثر انسانی نفس اور ذہن پر ساحرانہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آج جسے ہم عوامی نظریہ (folk theory) سمجھتے ہیں وہ ممکن ہے مستقبل میں ایک تسلیم شدہ (established fact) بن جائے۔ مثال کے طور پر یہ خیال صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ مخصوص جڑی بوٹیوں سے مخصوص بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ سائنسدانوں نے اس بارے میں تحقیقات شروع کر دیں تاکہ ان کی ادویاتی قدر (Medicinal Value) کا پتہ چلایا جاسکے۔ حال ہی میں سائنسدانوں نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ "بھلاواں" (Bhilawa-Indian blacknut) جسے برس ہا برس سے آدی باسی اور دیہاتی لوگ زخم کو سکھانے (anticeptic) کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں اسے کینسر (cancer) جیسے مہلک مرض روک تھام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے[4]۔ بہرحال اگر سماجیات کے ماہر عوامی نظریوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو ان کا مطلب ان عقیدوں کی فلسفیانہ تاویل اور توضیح اور ان کی صحت اور صداقت کی چھان بین ہوتی ہے۔

سائنسی طریقے (Scientific method) کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے بارے میں پیش قیاسی کی جاسکے جس کی بنا پر نامناسب حالات پر قابو پانے میں آسانی ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سائنس کے ذریعے واقعات کی پیش قیاسی قطعی طور پر ممکن ہے بلکہ اتفاقات اور امکانات کے بارے میں کم و بیش صحیح نتیجے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسمی حالات کے بارے میں پیش قیاسی اسی رجحان کی تائید کرتی ہے۔ جب اخباروں اور ریڈیو میں یہ خبر نشر ہوتی ہے کہ "آج بارش کا اسّی فیصد امکان ہے" تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ موسمیات کے ماہروں نے ابر اور ہواؤں کے دباؤ سے یہ اندازہ لگایا ہے۔ یہ خبر اکثر و بیشتر صحیح ہوتی ہے اور اسی پیش قیاسی کی بنا پر احتیاطی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

ظاہر ہے سائنس کی اس تعریف کا اطلاق تمام علوم پر یکساں نہیں ہوتا کیونکہ طبعی اور سماجی مظاہر کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی نوعیت کے پیش نظر معلومات کے مجموعہ کو مختلف شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے مثلاً

1 - طبعی یا فطری علوم — Physical or social sciences
2 - حیاتیاتی علوم — Biological Sciences
3 - سماجی علوم — Social Sciences

سائنس کی درجہ بندی

طبعی یا فطری علوم: PHYSICAL or SOCIAL SCIENCES

ان علوم کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی غور و فکر، عمل اور تجربوں کی، لہٰذا انسان کے ذہنی اور سماجی ارتقاء کے ساتھ ان علوم نے بھی ارتقاء کی منزلیں طے کیں جس کی وجہ سے ہر دَور اور ہر زمانے میں سائنس کے نظریوں اور زاویۂ نگاہ میں فرق معلوم ہوتا ہے۔

مصر اور بابل کی قدیم مصنوعات اور فنِ تعمیر اس امر کی شاہد ہیں کہ طبعیات (Physics)، ریاضی (Mathematics) اور فلکیات (Astronomy) کے متعلق زمانۂ قدیم سے لوگوں کو کافی معلومات تھیں۔

قدیم یونانیوں نے دوسرے علوم کی طرح طبعی علوم کو بھی استدلالی علم کی شکل دی اور یہ علوم جو اب تک دیوی دیوتاؤں یعنی Mythological بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے اب مابعد الطبیعات (Meta Physics) سے بحث کرنے لگے۔ قدیم یونانیوں کا علم عربوں کے توسط سے موجودہ دُنیا تک پہنچا اور جب جنوبی یورپ کے کتب خانے عربوں کے تصرّف میں آئے تو انھوں نے ان تمام یونانی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ عربی سے ان کا ترجمہ یورپ کی دوسری زبانوں میں ہُوا جس کی وجہ سے بنیادی علوم سے تمام دُنیا رُوشناس ہوئی۔

سائنس کے اعتبار سے عربوں کا یہ رُجحان یونانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن اُنھوں نے نئے نئے آلات کی ایجاد میں جو سبقت حاصل کی اس کی بنا پر تحقیق کے لیے نئی راہیں کُھل گئیں۔ بتدریج ماہرین سائنس نے ہر اس چیز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو عقل اور تجربے کے منافی ہو۔ اس طرح سائنس توہمات، تخیل اور فلسفے کی گزرگاہوں سے ہوتی ہوئی تحقیق اور تجربے کی راہ پر چل پڑی۔ یعنی انسان جس دُنیا میں رہتا بستا ہے۔ اس کی میکانیت اور ساخت کو سمجھنے اور اس دُنیا میں واقع ہونے والے روزانہ کے واقعات اور اتفاقی حادثات کی توجیہہ کے لیے جو منظم اور استدلالی پہلو اختیار کیا گیا وہ طبعی علوم کی شکل میں ظاہر ہُوا۔ غرض سائنس دانوں کے قدرتی مظاہر کا سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے کئی اصول اور کُلیات مرتّب کیے جن کا مطالعہ طبیعات، کیمیا، ارضیات اور فلکیات وغیرہ میں کیا جاتا ہے۔

طبیعات : PHYSICS

طبیعات ایک طبعی علم ہے جس میں مادّہ (Matter)، توانائی (energy) اور ان دونوں کی بدلی ہوئی حالت سے بحث کی جاتی ہے۔

کلاسیکی طبیعات میں حرارت، روشنی، آواز، مقناطیس اور برقی قوت سے بحث کی جاتی تھی، لیکن جدید طبیعات میں جوہر (atom) کی ہیّت اور خاصیت، الیکٹرانکس اور بجلی کی ماہیت سے متعلق نظریوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اوّلین ماہرینِ طبیعات مادّے کے خواص اور ان کے مابین ردّعمل سے متعلق کلیات اخذ کیا کرتے تھے جن میں ارشمیدس (Archimedes)، ڈیموکرائٹس (Democritus) اور تھالیس (Thales) وغیرہ کے نام بہت زیادہ مشہور ہیں لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں تحقیقی کام میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس زمانے کے ماہرین میں گالیلو (Galileo) کا نام گرتے ہوئے اجسام (falling bodies)، بوائلے (Boyle) کا گیاس، نیوٹن (Newton) کا کشش اور روشنی (Gravitation & light) اور وولٹا (Volta) کا بجلی پر عملی تحقیق کرنے کی وجہ سے بجا طور پر مشہور ہوا۔ غرض اس زمانے میں علمِ طبیعات میں اتنا زیادہ تحقیقی کام ہوا کہ بیشتر مفکّرین مستقبل کی تحقیقوں کو ماضی کی تحقیقوں کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد رونٹگن (Roentgen) نے ایکسرے پر، بیکورل (Becquerel) نے ریڈیو ایکٹیویٹی (Radio activity) پر، تھامس (Thomas)، روتھرفورڈ (Rutherford) اور بھور (Bhor) وغیرہ نے جوہر کی ساخت پر اور آئن شٹائن (Einstein) نے اضافیت کے نظریہ (Theory of Activity) پر کافی تحقیقی مواد جمع کیا۔

غرض جدید طبیعات جوہری طبیعات (Atomic Physics)، مرکزی طبیعات (Nuclear Physics) اور (Solid State Physics) سے بحث کرتی ہے جس کا اصل مقصد مختلف قسم کی توانائی کو جو ذرّات (Particular) اور جوہر (atoms) وغیرہ میں مقید ہیں، آزاد کر کے انسان کی روزمرہ زندگی میں استعمال کے قابل بنایا جائے۔

اس طرح طبیعات کا علم جو طبعی علم سمجھا جاتا تھا بالکلیہ اطلاقی سائنس بن گیا ہے۔ اب ایکسرے اور (Ultra Violet Rays) کی وجہ سے امراض کی تحقیق اور معالجے میں

بہت زیادہ سہولت ہوگئی ہے برقی مقناطیسی قوت ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں کام آتی ہے۔ Solid state electronics کو ٹرانسسٹر اور کمپیوٹر کے تیار کرنے میں استعمال کیا جارہا ہے۔ غرض ہم ایک ایسے سائنسی دَور میں رہتے ہیں جہاں طبیعات کی اطلاقی معلومات کی بنا پر زندگی میں آرام اور سہولت کا عنصر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

کیمیا: CHEMISTRY

ہر وہ شے جسے ہم دیکھتے اور چھوتے ہیں وہ مادّے سے بنی ہوتی ہے۔ یہ کتاب، ہمارا جسم، جو غذا ہم کھاتے ہیں، ہوا، پانی، سُورج، چاند، تارے اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جو ہمارے اطراف و اکناف موجود ہیں سب مادّے ہی ہیں۔

مادہ کوئی بھی چیز ہوسکتی ہے جو وزن دار ہو اور جگہ گھیرتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دو چیزیں ایک ہی وقت میں ایک جگہ پر نہیں رکھی جاسکتیں۔ مثال کے طور پر اگر گلاس میں پہلے سے پانی بھرا ہُوا ہو تو پھر ہم اس گلاس کو دُودھ سے نہیں بھر سکتے اور جب ہم کبھی خالی برتن میں کوئی چیز بھرنا چاہتے ہیں تو اس میں جو ہوا موجود رہتی ہے وہ باہر آجاتی ہے تاکہ دوسری چیز کے لیے جگہ خالی ہوجائے، لیکن سائے اور خلاء (Vaceeum) کا شمار مادہ میں نہیں ہوتا کیونکہ نہ تو یہ وزن دار ہوتے ہیں اور نہ جگہ گھیرتے ہیں۔

مادہ نہ تو ضایع ہوتا ہے اور نہ فنا ہوسکتا ہے اور نہ اس کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کی شکل بدلی جاسکتی ہے۔

کیمیا وہ علم ہے جس میں مادّہ کی ہیت اور اس کی ساخت کی تبدیلیوں سے بحث کی جاتی ہے اور ان اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے جس کی وجہ سے مادّہ میں تبدیلی آتی ہے۔ کیمیا کی اہم شاخیں نامیاتی کیمیا (Organic Chemistiy)، غیر نامیاتی کیمیا (in Organic Chemistry)، طبعی کیمیا (Physical Chemistiy)، کیمیائی انجینئرنگ (Chemical engineering) اور تجزیاتی کیمیا (an alytical Chemistry) وغیرہ ہیں۔

موجودہ سماج کی ترقی اور خوشحالی کا بہت کچھ دار و مدار کیمیائی ترقی پر منحصر ہے۔ مثلاً ہم بہتر پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد کا استعمال کرتے ہیں۔ پیٹرولیم اور کروڈ آئیل کا استعمال کرکے اپنی موٹر گاڑیوں میں تیز رفتاری سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرسکتے ہیں۔ پلاسٹک اور ربر کی صنعت سے

بے شمار اشیاء روزانہ استعمال میں آرہی ہیں۔ کھانے پینے کی بے شمار چیزوں میں کیمیائی عنصر کی شمولیت سے انھیں کئی ہفتوں اور مہینوں خراب ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ کاغذ، صابن، چمڑے، رنگ اور Cosmetics وغیرہ سب کچھ کیمیائی ترقی کی شاہد ہیں۔

کیمیا سے تعمیری اور تخریبی دونوں قسم کے کاموں میں مدد لی جاتی ہے۔ میدانِ جنگ میں دھماکو اشیاء کے استعمال سے تباہی اور بربادی پھیلتی ہے اور دوسری طرف فضا کی سمومیت (Air Pollulim) اور Swage اور اس کا عنصر اثرات سے بچانا سب کچھ ماہرینِ کیمیا کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ارضیات : GEOLOGY

ارضیات وہ علم ہے جس میں زمین کی کیمیائی ساخت اور اس کی طبعی خصوصیتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کی ایک اہم شاخ Paleontology ہے جس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ارضی دَور میں کس قسم کے حیوانات اور نباتات زمین پر بستے تھے، لیکن اب معدوم ہو چکے ہیں۔

اس علم کی بدولت زمین کے اندر پوشیدہ خزانوں کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی اس امر کا پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ زمین کے طبقات کے نیچے کون کون سی خام اشیاء ہیں جو انسان کے لیے روزمرّہ زندگی اور صنعت میں کام آسکتی ہیں مثلاً لوہا، تانبہ، جست، سونا اور چاندی کے علاوہ یورینئم اور ریڈیم کی تلاش۔ پیٹرولیئم کے ذخائر کا پتہ لگانا ارضی کیمیا اور ارضی طبیعات کے تحت آتا ہے۔ انسان کی جان اور ملکیت کو نقصان پہنچانے والی ارضی عوامل کا مطالعہ جیسے طوفان اور زلزلوں کی آمد کا ریکارڈ رکھنا اور اس کے متعلق پیشن گوئی کرنا۔ زمین کے نیچے پانی کے ماخذ کا پتہ لگانا اور زمین اور چٹانوں کی قوّت کا اندازہ لگانا تاکہ یہ پتہ لگایا جاسکے کہ فلک بوس عمارتوں کے لیے یہ موزوں ہیں یا نہیں۔ یہ تمام مضامین ارضی انجینئرنگ کے زیرِ بحث آتے ہیں۔

فلکیات : ASTRONOMY

فلکی اجسام کا سائنٹفک مطالعہ جس میں نظامِ شمسی اور اس کے دائرے میں پائے جانے والے تمام مادّے شامل ہیں۔

دوسرے سائنسی موضوعات کی طرح فلکیات بھی ایک خالص مضمون باقی نہیں رہا بلکہ اس کو دوسرے علوم کے ساتھ شامل کرکے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے اطلاق میں سہولت ہوتی ہے۔ مثلاً فلکیات کی ذیلی شاخیں فلکی طبعیات (Astro-Physics)، فلکی کیمیا (Astro-Chemistry)، فلکی ارضیات (Astro-geology)، فلکی فوٹوگرافی (Astronomical Photography) وغیرہ ہیں۔ گذشتہ چالیس پچاس سال کے عرصے میں خلائی جہاز اور خلائی ہوابازوں کے چاند اور مریخ پر پہنچنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں جس سے فلکیات کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے۔

حال ہی میں ریڈیو اور راڈر (Radar) کے استعمال سے دوسرے سیاروں (Satellite)، اور چاند وغیرہ کی ساختی کیفیتوں کا اندازہ لگانا ممکن ہوگیا ہے۔ راڈر اور ریڈیو شعاعیں گردگیس اور بادلوں کو چیر کر فضا میں دوسرے سیاروں تک پہنچتی ہیں۔ اس طرح زہرہ، مشتری، چاند وغیرہ تک پہنچنا اب ناممکن نہیں رہا اور جو نئے اجسامِ فلکی نزدیک ہیں ان پر ریڈیو سگنل وصول بھی ہو رہے ہیں اور بھیجے بھی جاسکتے ہیں۔ لہٰذا علمِ فلکیات اب ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔

حیاتیاتی علوم: BIOLOGICAL SCIENCES

"Bio" کے معنی زندگی کے ہیں اور "logy" کے معنی سائنس کے۔ اس لحاظ سے 'biology' کے لفظی معنی زندگی کا مطالعہ کرنے والا علم۔ بیالوجی میں حیاتیات اور نباتیات کا شمار ہوتا ہے جس میں پودوں اور حیوانوں کی ابتدار، ارتقار، نوعی اختلافات، خصوصیتوں کا مرکز ظاہر ہونا، فطری انتخاب، ماحول کے اثرات، ان کی ساخت اور فعلیت سے بحث کی جاتی ہے۔

نباتات: BOTANY

نباتات ایک بنیادی سائنس ہے۔ اس کی ابتدار جڑی بوٹیوں کی ساخت اور اُن کی خصوصیتوں کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ ان سب تحقیقوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ کس طرح پودوں کو انسان کے فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے تحقیق کا نقطۂ نظر چاہے کچھ ہی رہا ہو اب نباتات کی کئی ایسی شاخیں ہیں جو بالکلیہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے سماج کی ترقی میں

حصّہ لے رہی ہیں مثلاً زراعت اور باغبانی جینیات (Genetics) اور mycology میں فصل کو نقصان پہنچانے والے امراض اور پودوں کی توریثی خصوصیتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ ان کی روک تھام کے ذریعے ملک کی اقتصادیات کو فائدہ پہنچے۔

پیداوار اور تجارت کے علاوہ دودھ کے حاصلات (dairy Products) مثلاً مکھن، پنیر، دہی، کھویا وغیرہ کی بڑے پیمانے پر تجارت نباتیات کے اطلاقی علم پر منحصر ہے۔ کپاس سے سُوتی کپڑے اور تعمیرات کے لیے جو بیشتر پودوں اور درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان کی غذائی پیداوار کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے تو پھر پودوں کی تعداد کا ستّر فیصد حصّہ اس میں آجائے گا۔ اس لیے ایسے تمام پودے جو انسان کے کسی نہ کسی طرح کام آتے ہیں ان کی افزائش کرنا اور ان کی نوع کی ترقی کے لیے بھی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس نسلی ترقی اور پیداوار میں اضافے کے لیے Genetics سے مدد لی جاتی ہے اور نئی طاقتور انواع پیدا کی جاتی ہیں۔

پودوں کی ایک اور ذیلی شاخ فعلیات کی تحقیق کی بدولت بے موسم کے پھول اور پھل اور بغیر بیج والے پھل اُگائے جاسکتے ہیں۔

حیوانیات: ZOOLOGY

حیوانیات میں جانوروں کی درجہ بندی، ساخت، فعلیت، افزائشِ نسل، ماحول کے اثرات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

حیوانیات کی ایک ذیلی شاخ افزائشِ جانوران (Animal husbandry) ہے جس میں ایسے تمام گھریلو جانوروں کی افزائش کی جاتی ہے جو انسان کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں اور ان سے انسان کی غذائی ضروریات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً گوشت اور گوشت کے حاصلات، کھال اور اُون کی صنعت، پولٹری فارمنگ وغیرہ۔

ایک اور غذائی صنعت سمکیات (Fisheries) بھی ہے جسے انسانی غذا کے ماخذ کے طور پر بہت اہمیت اور ترقی دی جارہی ہے۔

حیوانیات سے متعلق دو ذیلی علوم طفیلیات (Parasitology) اور Entomology ہیں۔ جب جانوروں کی افزائش کی جاتی ہے تو ایسے عضویے بھی خودبخود نشو ونما پانے لگتے ہیں جو بیماریوں اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان دونوں علوم میں ایسے ہی عضویوں کا مطالعہ کیا جاتا

ہے جو جانوروں میں طفیلی زندگی بسر کرتے اور ان کو بیمار یا کمزور کر دیتے ہیں۔

تمدنی یا سماجی علوم : CULTURAL or SOCIAL SCIENCES

جس طرح فطری مظاہر طبعی علوم کا نفسِ مضمون ہیں اسی طرح سماجی مظاہر کی تشریح و توضیح تمدنی علوم کی بحث کا مرکز و محور ہیں۔ سماجی علوم کا وجود سراسر انسان کے وجود کا مرہونِ منت ہے۔ اگر روئے زمین پر انسان کا وجود نہ ہوتا تو سماجی علوم کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی چند روزہ ہے اور اس کی بنیادی ضرورتیں غذا، لباس، مکان اور جنسی جذبے کی تکمیل تک محدود ہیں، لیکن انسان ان بنیادی احتیاجوں اور بے شمار خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اس قدر سرگرداں رہتا ہے اور اتنے نت نئے طریقوں سے ان احتیاجوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد کرتا ہے کہ وہ سماجی علوم کے لیے انتہائی وسیع اور دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انسانی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کا دائرہ جتنا زیادہ وسیع ہے اتنی ہی وسعت سماجی علوم کے نفسِ مضمون میں پائی جاتی ہے۔

سماجی زندگی میں بے حد تنوع پایا جاتا ہے اس لیے سماجی زندگی کی مختلف نوعیتوں کا مطالعہ سائنسی نقطۂ نظر سے سماجیات، معاشیات، سیاسیات، لسانیات، قانونیات، انسانیات، شہریات، مذہبیات، علم تعلیم، تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ کئی دوسرے علوم میں کیا جاتا ہے۔ سماجی زندگی میں پیچیدگی اور وسعت ہونے کی وجہ سے کسی ایک سماجی پہلو کا مطالعہ بھی کسی ایک مخصوص سماجی علم کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے ان علوم کی کئی ذیلی شاخیں ہو گئی ہیں مثلاً سماجیات ہی کو لیجیے جس میں نظری سماجیات، اطلاقی سماجیات، دیہی سماجیات، شہری سماجیات، صنعتی سماجیات، مذہبی سماجیات، تعلیم کی سماجیات، سماجی نفسیات، خاندانی سماجیات اور سماجی سیاسیات کے علاوہ اور کئی شاخیں سماجی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا مطالعہ گہرائی اور سنجیدگی سے کرتی ہیں۔ یہی حال تمام سماجی علوم کا ہے :

پروفیسر بیننگ اور بیننگ (Prof Bining and Bining) نے سماجی علوم کی وضاحت اس طرح کی ہے :

"The social sciences are those wich relate to the origin, organisation or deve-

lopment of human society and to the improvement of the social, economic, political & cultural Conditions under which man lives. They treat all the activities, achivements, and attainments of man kined and are as extensive as the scope of human intrests and associations."[5]

یعنی "سماجی علوم کا تعلق انسانی سماج کی ابتدا، تنظیم اور ارتقا، اور انسان کی سماجی، معاشی سیاسی اور تمدّنی حالت کو بہتر بنانے سے ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی تمام مصروفیتوں، کارناموں اور حاصلات سے بحث کرتے ہیں اور انسانی تعلّقات اور دلچسپیوں میں جس قدر وسعت ہے، اتنی ہی وسعت سماجی علوم میں پائی جاتی ہے"۔

سلیگمان (Seligman) نے سماجی علوم کی انتہائی جامع اور مختصر تعریف کی ہے:

"The social sciences may be defined as those mental or cultural sciences which deal with the activities of the individual as a nember of a group."[6]

یعنی "سماجی علوم کی تعریف ان ذہنی اور تمدّنی علوم کی حیثیت سے کی جاتی ہے جو فرد کی جدوجہد کا مطالعہ ایک گروہ کے رکن کی حیثیت سے کرتے ہیں"۔

سماجی علوم کی ان دو مستند تعریفوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سماجی علوم کے مطالعے سے ہم سماجی اداروں کی نوعیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور سماجی علوم کی رہنمائی سے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور تقاضوں سے انفرادی اور سماجی طور پر مطابقت کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

یہ تو کھُلی حقیقت ہے کہ انسان کچھ کھو کر پانے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا جنگ کے بعد امن اور متعدی امراض پھیلنے کے بعد انسدادی دواؤں اور صحت بخش طریقوں پر زور دیا جاتا ہے۔ بے روزگاری پھیلنے کے بعد امدادی طریقوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جُرم اور قتل کی وارداتیں پیش

آنے کے بعد ان پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہی اور اسی قسم کے متعدد سماجی مظاہر ہماری توجہ سماجی علوم کی طرف مبذول کرواتے ہیں، کیونکہ ان عناصر کی وجہ سے انفرادی، خاندانی سماجی، قومی اور بین اقوامی زندگی میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ان حالات میں سماجی علوم کی وجہ سے ذہنی تحفظ (Security of mind) حاصل ہوتا ہے۔

تمدنی یا سماجی علوم کے نقطۂ نظر کی وضاحت سے پہلے اس بنیادی حقیقت پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان تنہائی میں زندگی نہیں گزار سکتا۔تنہائی میں زندگی گزارنے اور ہر قسم کے سماجی تعلقات سے مبرا وہ ہستیاں ہوتی ہیں جنھیں یا تو فوق البشر (Super human) کہا جاتا ہے یا تحت بشر (Sub human) کیونکہ عام انسان کی بنیادوں ضرورتوں اور خواہشوں کے لیے سماج کے مختلف اراکان سے ربط اور میل ملاپ ناگزیر ہے، اسی لیے پروفیسر وارڈ نے کہا تھا کہ انسان سماجی واقع ہوا ہے، یا نہیں ایک بحث طلب امر ہے، لیکن سماجی زندگی کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا دوسرے افراد سے ربط قایم رکھنا ناگزیر ہے۔

اگر ہم کسی فرد کی ایک دن کی مصروفیت کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف لوگوں سے ربط میں آتا ہے، جن میں کسی کا تعلق کاروبار سے ہوتا ہے تو کسی کا تعلیم سے، کسی کا مذہب سے ہوتا ہے تو کسی کا سیاست سے، کسی کا تفریح سے ہوتا ہے تو کسی کا ڈاکٹری سے۔ بہرحال وہ اپنی مختلف سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے سلسلے میں مختلف افراد اور اداروں سے ربط میں آتا ہے۔انسانی جدوجہد کے یہی مختلف سماجی روپ سماجی علوم کے موضوع بحث قرار دیے جاتے ہیں جن کا آپس میں ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔

مختصر یہ کہ سماجی علوم سماجی مظاہر کو اپنا موضوع بحث بناتے ہیں۔ان کے درمیان نظریات اور تحقیق کے موضوعات کا فرق ہے۔علمی شعبوں کے درمیان تحقیق کے طریقوں اور موضوعات کی تقسیم واضح ہے۔انسانیات بڑے انکسار سے اعلان کرتی ہے کہ وہ "انسان کا علم" ہے۔نفسیات بڑی احتیاط سے اپنے آپ کو "کردار کا علم" قرار دیتی ہے۔معاشیات کا دعویٰ ہے کہ وہ "وسائل زندگی کا مطالعہ" ہے۔سیاسیات "اقتدار کا علم" ہے۔"سماجیات" سماج اور سماجی تعلقات" کو اور تاریخ "ماضی کے سائنسی مطالعہ" کو اپنا نفس مضمون قرار دیتی ہے۔اس تخصیص کی بنا پر ہر جامعہ میں جداگانہ شعبوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔یوں تو سارے سماجی علوم کا موضوع ایک ہی ہے یعنی سماجی زندگی کے حقائق کی تحقیق۔فرق ہے تو صرف زاویۂ نگاہ کا اور کسی سماجی پہلو کے تعلق سے توجیہہ کی نوعیت کا ہے۔

لحاظ سے ہر سماجی علم اپنا مخصوص موضوع پیش نظر رکھ کر سماجی مظاہر کے انبار سے صرف وہی مواد ڈھونڈھ نکالتا ہے جو اس مخصوص موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بُنیادی فرق کے باوجود تمام سماجی علوم ایک دوسرے کے نظریوں اور تحقیقات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جس کی وجہ سے سماجی مظاہر اور مختلف النوع سماجی مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی بناء پر تمام سماجی علوم میں بہت گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

سماجیات : SOCIOLOGY

سماجیات کے نفس مضمون پر غور کرنے سے پہلے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ سماج کے دوسرے افراد کے ساتھ مل جُل کر رہنے سے وہ اپنی بُنیادی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ سماج کے ساتھ افراد کا تعلق اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ انسان کی وہ حالت جب کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہو ہمارے تصوّر سے باہر ہے۔

سماجیات اور نفسیات کے ماہروں نے ایسی کئی تحقیقیں کی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بچے جن کی پرورش غیر انسانی ماحول میں ہوتی تھی ان تمام نعمتوں سے محروم رہے جن کی بناء پر انسان اور حیوان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے مثلاً زبان جو ترسیل یا Cemmunicalion کا اہم ذریعہ ہے؛ تمدن جو انسان کا ورثہ ہے؛ میل ملاپ اور آدابِ محفل کے وہ طریقے جو انسانیت کا شیوہ ہیں۔ اس لحاظ سے ایک حیاتیاتی عضویہ (biological organisum) کو سماجی عضویہ (Social organisum) میں ڈھالنے کے لیے سماجی ربط اور سماجی تعلقات ناگزیر ہیں۔ اس پس منظر میں سماجیات کی چند تعریفوں پر غور کرنے سے سماجیات کے نفسِ مضمون (subject Matter) کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کمبل ینگ (Kimball young) کا کہنا ہے:

"Sociology deals with the behavior of men in groups."

یعنی "سماجیات انسان کے گروہی برتاؤ کا مطالعہ کرتا ہے۔"

ای۔ اے۔ راس (E.A. Ross) کے مطابق

"The Scince of Social Phenomena."

یعنی "سماجی مظاہر کے مطالعہ کا نام ہے۔"

اے۔ڈبلیو۔اسمال (A.W.Small) کے لحاظ سے:

"Sociology is the science of social processes."

یعنی "سماجیات سماجی طریق کا علم ہے۔"

میک آئیور (Mac Iver) کی تعریف کی رُو سے:

"The subject matter of sociology is social relationships."

یعنی "سماجیات کا نفسِ مضمون سماجی تعلّقات ہے۔"

جب ہم ان مختلف تعریفوں پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کے اطراف سماجی تعلّقات کا ایک جال بنا ہوتا ہے جو نہ صرف زندگی کی بقا، بلکہ انسان کی ذہنی، نفسی اور عملی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے ذریعے مشترک مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔

سماجی تعلّقات کا انحصار سماجی بین عمل یا Social interaction پر ہوتا ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں ملتے ہیں تو وہ موقع محل کے لحاظ سے مختلف حرکات و سکنات، اشاروں اور الفاظ کے ذریعے اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس بین عمل کی وجہ سے برتاؤ کے طریقے مختلف نوعیت اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر اے۔ایم روز (Prof. A.M. Rose) نے سماجیات کا نفسِ مضمون ان ہی بین عمل کے طریقوں کو قرار دیا ہے:

"Sociology is the science of interaction among people & the effects of this interaction an human behavior."[1]

یعنی "سماجیات بین عمل کا علم ہے اور وہ ان اثرات کا مطالعہ کرتا ہے جو انسانی افعال پر مرتّب ہوتے ہیں۔"

سماجیات میں بین عمل کو ایک بُنیادی سماجی طریق سمجھا جاتا ہے جس پر تمام حرکیاتی سماجی تعلّقات (dynamic social relations) کی بُنیاد ہوتی ہے۔ سماجیات میں محض چند افراد کا جمع ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ان کا آپس میں ایک دوسرے افعال و اعمال پر اثر

انداز ہونا ضروری ہے مثال کے طور پر کالج کو لیجیے جو کئی افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی کالج میں افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں کم، لیکن ہر کالج میں فرد کے ذمّے مخصوص کام ہوتے ہیں جسے وہ مخصوص جگہ پر، مخصوص وقت پر انجام دیتا ہے۔ ہر روز مختلف افراد مقررہ وقت پر اپنی جماعتوں یا تجربہ گاہوں میں چلے جاتے ہیں، مقررہ نشستوں پر بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس عمل یا Action سے اُستاد اور شاگرد، آفیسر اور ماتحت کا فرق واضح ہوتا ہے مختصر یہ کہ کالج کے وجود کے لیے صرف تعداد ہی ضروری نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص طریقے پر افراد کی تنظیم اہمیت رکھتی ہے۔ اس تنظیم اور ترتیب (arrengement) کی وجہ سے کام کی نوعیت کا فرق واضح ہوتا ہے اور مختلف افراد کے رول کو مختلف معیاروں اور اصولوں کی روشنی میں میں جانچا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس تشکیل کے زیرِ اثر آتے ہیں ان میں یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ دوسروں کی ان سے کیا توقعات وابستہ ہیں اور وہ دوسروں سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ غرض جب ہم کالج کی ساخت Structure اور فعلیت (function) پر غور کرتے ہیں تو ان افعال و اعمال کی وضاحت ہو جاتی ہے جو مختلف حیثیتوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یہاں پر جو نکتہ اہم ہے وہ شخصی خصوصیتوں کی جانچ پڑتال نہیں ہے بلکہ ان اجتماعی افعال سے بحث ہے جو ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انجام دینے پڑتے ہیں۔

پروفیسر روز کی تعریف کے مطابق سماجیات کا موضوعِ بحث سماجی بین عمل ہے جس پر تمام سماجی تعلقات کا دارومدار ہے جس طرح سماجی بین عمل کا دائرہ وسیع ہے اسی طرح سماجی تعلقات کا میدان وسیع تر۔ تعلقات کا تعلق ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے مثلاً خاندان، معاش، سیاست، تعلیم، مذہب، تفریح وغیرہ۔ یہ ضرور ہے کہ ہر سماجی ادارہ میں تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اگر خاندان جیسے بُنیادی ادارہ سے ہمارے تعلقات خونی رشتے پر مبنی ہونے کی وجہ سے بے تکلفانہ، غیر رسمی، براہِ راست، مُنہ در مُنہ، مُستقبل اور پائیدار ہوتے ہیں تو دوسرے سماجی اداروں کی بُنیاد معاہدوں کی بناء پر ہونے کی وجہ سے تعلقات کی نوعیت رسمی، عارضی، رضاکارانہ، تکلّف آمیز، قواعد اور ضوابط کی پابندی ہوتی ہے۔ سماجیات میں تعلقات کی یہ تمام نوعیتیں زیرِ بحث آتی ہیں اور ان تعلقات سے پیدا ہونے والے اثرات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

سماجیات کی مختلف تعریفوں پر غور کرنے کے بعد سماجیات کے نفسِ مضمون کا تعین آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سماجیات میں سماجی تعلقات کے تمام پہلو، سماجی بین عمل کے تمام مراتب

انسانی افعال و اعمال کا مطالعہ، سماجی کنٹرول، سماجی تبدیلی، سماجی ادارے، سماجی گروہ، سماجی درجہ بندی، سماجیات کے طریق، شخصیت، مجمع، انجمن، کمیونٹی، تمدن، سماج کی اساس وغیرہ شامل ہیں۔
سماجیات میں سماجی سسٹم کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مختلف سماجوں کے درمیان جو مشترک اور غیر مشترک عنصر پائے جاتے ہیں ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس امر کی تحقیق کی جاتی ہے کہ سماجی سسٹم کی مخصوص ضرورتیں کیا ہیں؟ کس طرح ان ضرورتوں کی تکمیل عمل میں آتی ہے؟ کیا ساخت اور فعل میں ایسا ربط پایا جاتا ہے کہ جب ایک تبدیل ہو جائے تو دوسرا بھی بدل جائے؟ انسانی زندگی میں تصادم، مسابقت اور تعاون کے کیا اصول ہیں؟ گروہی کردار کے ترکیباتی اصول کون سے نہیں؟ باہمی محرکات، اجتماعی علامتیں سماجی رسم و رواج، انسانی ترسیل اور روابط کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کس اعتبار کی بنا پر انسانی شخصیت سماجی پیداوار ہے؟ مختلف سماجی حالات میں افراد کا ردّعمل کس طرح ہوتا ہے؟ وہ کون سی سماجی قوتیں گروہ کے استحکام اور کمزوری کا باعث قرار دی جا سکتی ہیں؟ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر سماج میں تبدیلی آتی ہے؟ کیا سماجی تغیر دائرہ میں حرکت کرتا ہے یا خطِ مستقیم کی صورت میں؟ کون سی قوتیں سماجی تغیر کی رفتار کو متاثر کرتی ہیں؟ اس رفتار کی کس طرح پیمائش کی جا سکتی ہے؟ کیا سماج کے مختلف شعبے یکساں رفتار سے بدلتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو رفتار کے اس فرق کے اسباب کیا ہیں؟

یہ چند ایسے بنیادی سوال ہیں جو سماجیاتی بحث کا موضوع قرار دیے جاتے ہیں اور جن کا جواب دینے کی کوشش ایک دلچسپ، بامعنی اور بامقصد عمل ہے۔ جن سے سماجی مظاہر اور سماجی حقائق پر روشنی پڑتی ہے لیکن کسی بھی سماجی عمل کا قطعی جواب ممکن نہیں۔

سماجیات کی نوعیت : THE NATURE OF SOCIOLOGY

سماجیات کے نفسِ مضمون پر غور کرنے کے بعد اس مضمون کے بارے میں چند ایسے واضح خط و خال ذہن میں ابھرتے ہیں جن کی بنا پر سماجیات کی اس نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے طبعی اور سماجی علوم میں مقابلے میں سماجیات کس حد تک الگ ہے۔

سماجیات کی سب سے بنیادی اور واضح نوعیت یہ ہے کہ اس کا تعلق طبعی علوم سے نہیں ہے بلکہ وہ سماجی علوم کی ایک شاخ ہے۔ یہ فرق سماجیات کے نفسِ مضمون کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ سماجیات کا موضوعِ بحث اسماجی امور کی تفہیم اور تشریح اور سماجی مظاہر کی عکاسی ہے جس کی

وجہ سے اس کی نوعیت طبیعات، کیمیا، ارضیات، حیاتیات، فلکیات اور ان کی ذیلی شاخوں سے بالکل جُداگانہ ہو جاتی ہے۔

جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے اس میں بھی سماجیات کی نوعیت فلسفے دنیات اور مذہب سے اس حد تک الگ ہے کہ سماجیات سماجی اقدار کی بحث میں نہیں پڑتا ہے سماجی اداروں اور سماجی گروہوں یا سماج کی مختلف نوعیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے سماجیات میں درپیش ہونے والی کیفیتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس لیے سماج کے بے مخصوص راہوں کا تعین ممکن نہیں اس لیے سماجیات کے پیشِ نظر "کیا ہے ؟" زیادہ اہمیت رکھتا ہے، نہ کہ "کیا ہونا چاہیے تھا ؟" اس لحاظ سے سماجیات اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط، نیکی اور بدی سے متعلق اقدار کا پرچار نہیں کرتا بلکہ اس کے اظہار کا طریقہ اس طرح جُداگانہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی سماجی گروہ کسی سماجی اقدار کا پابند ہے تو اس کے کیا نتیجے نکلتے ہیں ؟ غرض سماجیات میں اضافی نوعیت کے امور زیرِ بحث آتے ہیں نہ کہ قطعی۔

سماجیات ایک Pure science ہے نہ کہ اطلاقی یا Applied یہاں پر کچھ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس امر کے نکتے کی فصاحت سے ممکن ہے یہ احتمال کم ہو جائے کہ جس طرح طبیعات، فلکیات، ریاضی، کیمیا، جسمانیات، حیوانیات، نباتیات، ارضیات، تاریخ اور معاشیات Pure science ہیں اسی طرح سماجیات بھی ہے۔ جس طرح طبیعات کے ماہر پلوں کی تعمیر نہیں کرتے، جسمانیات کے ماہر مرض کی تشخیص نہیں کرتے اور دواساز نسخے تجویز نہیں کرتے اسی طرح سماجیات کے ماہر سماجی پالیسی کا تعین نہیں کرتے اور نہ وہ جسمانی اور ذہنی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ سماجیات ایک Pure science ہونے کی حیثیت سے مختلف النوع سماجی مظاہر سے متعلق ایسا وسیع مواد اکٹھا کرتا ہے جو قانون ساز جماعتوں، سفارتی محکموں، سیاست دانوں، اُستادوں، شہریوں اور سماجی کارکنوں وغیرہ کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طرح سماجیات کا تعلق نظم و نسق، قانون سازی، تعلیم اور سماج کاری وغیرہ سے ایسا ہی ہے جیسا کہ طبیعات کا انجینئرنگ سے، فلکیات کا جہاز رانی سے، ریاضی کا حساب فہمی سے، کیمیا کا ادویات سازی سے، جسمانیات کا علم طب سے، حیوانیات کا افزائش جانوران سے، نباتیات کا زراعت سے، ارضیات کا پیٹرولیئم انجینئرنگ سے، تاریخ کا جرنلزم سے، معاشیات کا کاروبار سے۔

سماجیات ایک تجریدی یعنی Abstract سائنس ہے، نہ کہ Cencrete۔ اس لحاظ سے سماجیات کی دلچسپی صرف واقعات کے ظہور پذیر ہو جانے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ

واقعات کی نوعیت اور اس کے مختلف شکلوں سے۔ گویا محض جنگ یا انقلاب بذات خود اہم نہیں بلکہ وہ سماجیاتی اہمیت اس وقت اختیار کرتے ہیں جب کہ جنگ یا انقلاب کا مطالعہ سماجی مظہر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے جس کی بنا پر وہ تصادم کے روپ میں کبھی کھلی اور کبھی چھپی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح سماجیات کسی تنظیم میں اس لیے دلچسپی لیتی ہے کہ وہ افراد کی مختلف دلچسپیوں اور مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ جیسے روٹری انٹرنیشنل یا لائنس کلب وغیرہ۔ اگر سماجیات میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں جیسے فرانسیسی، جرمن، ہندوستانی، چینی اور اسکیمو وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے تو ان کے تمدن کے مخصوص تمدنی نمونوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ برس ہا برس گزرنے کے باوجود ان کے تمدنی نمونوں میں کس حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

سماجیات کی ایک اور واضح نوعیت یہ ہے کہ وہ ایک عمومی علم یعنی Generalising Science ہے نہ کہ تخصیصی علم یعنی Particularising Science اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجیات میں سماجی بین عمل علم کی عام صورتوں، سماجی تعلقات کی مختلف نوعیتوں، سماجی گروہوں، سماجی اداروں کی ساخت اور فعلیت سے متعلق اصول مرتب کیے جاتے ہیں نہ کہ تاریخ کی طرح کسی ... اور مخصوص سماج کی مکمل اور مفصل داستان۔ مثال کے طور پر تاریخ میں اس واقعہ کی ... جاتی ہے کہ مسولینی (Mussolini) کے زمانے میں اٹلی نے ایتھوپینس (Ethiopians) پر حملہ کیا تھا۔ سماجیات میں اس واقعہ سے اس اہم سماجیاتی نکتے پر روشنی پڑتی ہے کہ خارجی جارحیت کی وجہ سے داخلی ہم آہنگی (internal harmeny) میں کس طرح شدت پیدا ہوتی ہے۔

غرض سماجیات ایک سماجی علم ہے۔ ایک بیانی علم ہے، ایک pure علم ہے، ایک تجریدی علم ہے، ایک مجموعی علم ہے، ایک استدلالی علم ہے اور تجزیاتی علم ہے جس کی وجہ سے سماجی تعلقات کی ہر نوعیت اور سماجی سسٹم کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔

سماجیات کی تاریخ: HISTORY OF SOCIOLOGY

سماجیات کی داستان تو نہایت طویل، لیکن تاریخ بہت مختصر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تہذیب کی ابتدا سے قبل ہی لوگ ایک دوسرے کے طرز برتاؤ کے بارے میں سوچتے رہے ہیں کہ کس طرح افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں اور کس وجہ سے ان میں اختلافات

پیدا ہوتے ہیں؟ عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ میں بھی مذہبی پیشواؤں، فلسفیوں اور تاریخ دانوں نے انسانی برتاؤ اور میل ملاپ کے طریقوں کے بارے میں کافی غور و خوض سے کام لیا تاکہ اخلاقی اصول مرتب کیے جا سکیں لیکن انھیں سائنٹفک اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کاملیت، صحت اور قطعیت نہیں اور نہ ہی انھوں نے cause and effect relations کی بنا پر سماجی امور کی چھان بین کی تھی۔ مغرب میں اس سلسلے کی سب سے اہم سماجیاتی تصنیف افلاطون (Plato) کی "دی ریپبلک" (The Republic) اور مشرق میں کانفوشیس (Confucius) کی "انالیکٹس" (Analects) سمجھی جاتی ہے۔

ابتدا میں تمام علوم کا سرچشمہ فلسفہ تھا۔ چاہے وہ طبعی علوم ہوں یا سماجی۔ اس لیے فلسفے کو مادرِ علوم یا "mater scientiarum" کہا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب کے فروغ کے بعد یکے بعد دیگرے تمام علوم علاحدہ سمتیں اختیار کرنے لگے۔ ان میں سب سے پہلے الگ ہونے والے علوم میں فلکیات (Astronomy) اور طبعیات (Physics) ہیں۔ اس کے بعد کیمیا، حیاتیات اور ارضیات۔ لہٰذا جو علم پہلے علمِ کائنات یا Cosmology تھا وہ فلکیات ہو گیا۔ جو فطری فلسفہ یا Natural Philosophy تھا وہ طبیعات ہو گیا۔ انیسویں صدی میں دو سماجی علوم نفسیات اور سماجیات بھی فلسفے سے الگ ہو گئے۔ نفسیات پہلے ذہنی فلسفہ mental Philosophy کہلاتا تھا اور سماجیات سماجی فلسفہ یعنی Social Philosophy یہ فلسفے ہی کا اثر ہے کہ سماجیات کے دو مشہور مفکر کونت (conte) اور اسپنسر (Spencer) سماجیات کی اصطلاح استعمال کرنے سے پہلے اپنی تصنیفوں کو "Synthetic Philosophy" اور "Positive Philosophy" کا نام دیتے ہیں۔ گو اب فلسفے سے کئی طبعی اور سماجی علوم الگ ہو چکے ہیں لیکن اب بھی مابعد الطبیعات یعنی Metaphysics، علمیات یعنی epistemology، منطق یعنی logic، دینیات یعنی Ethics اور جمالیات یعنی Aesthetics فلسفے سے وابستہ ہیں۔

ابتدائی مفکروں اور فلسفیوں میں جنھوں نے اس بات کی پیش قیاسی کی تھی کہ انسانی تعلقات کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک جداگانہ علم ہونا چاہیے اس میں سب سے پیش پیش نام عرب مفکر ابوزید عبدالرحمٰن ابن خلدون (Abu Zaid Abd-al Rahman Ibn Khaldun 1332–1406) کا ہے۔ اکثر مفکرین اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ابن خلدون ہی دراصل پہلا سماجیات کا ماہر ہے۔ ابن خلدون کا خیال تھا کہ فطری مظاہر کی طرح سماجی مظاہر بھی چند قانون

کے تابع ہیں۔ اگر سماج میں کسی قسم کی مرضیاتی کیفیت ظاہر ہو تو یہ ناممکن ہے کہ کسی فردِ واحد سے یہ سدھر سکے۔ کیونکہ سماجی قوتوں میں بڑا زبردست اثر ہوتا ہے۔ سماجی قانون (social Laws) کا پتہ اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ سماجی امور سے متعلق کافی مواد اکٹھا کر لیا جائے، یہ مواد ماضی اور حال میں پیش آنے والے واقعات سے جمع کیا جا سکتا ہے۔

ابن خلدون کا خیال تھا کہ سماج میں تبدیلیاں اور تنوع افراد اور گروہ کے باہمی ربط کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جس کا دار و مدار تقلید اور آمیزش (interm ixture) پر ہے۔

ابن خلدون کی سماجیات کا سب سے نمایاں پہلو سماجی ہم آہنگی (Social solidarity) کا تصوّر ہے۔ انسانی سماج کی اساس انسانی ضرورتیں ہیں۔ کوئی بھی فرد تنہا زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ وہ بغیر دوسروں کی مدد کے آلات اور اوزار بنا سکتا ہے۔ لہٰذا تعاون کے طریق کی وجہ سے انسان اپنی بنیادی ضرورتوں کو بھی پوری کر سکتا ہے اور اپنی نوع کی بقا کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔ انسان اور حیوان میں یہ فرق ہے کہ انسان اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر حیوانی جبلتوں کو کچل سکتا ہے، لیکن انسانوں کو اپنی اس صلاحیت کا استعمال اپنے ساتھیوں کو کچلنے کے لیے نہیں کرنا چاہیے جس کے لیے بہتر یہ ہے کہ اقتدار کسی ایک شخص کے ہاتھ میں رہے جو تمام افراد کی تخریبی سرگرمیوں پر کنٹرول رکھ سکے۔ اس لحاظ سے ابن خلدون کے پاس سماج اور مملکت کی ابتدا کے یہی ماخذ ہیں۔ اہم عنصر "ہم آہنگی" کا ہے جس کی بنا پر رشتہ داری، خونی رشتے اور چھوٹے گروہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد رہتے ہیں۔ باہمی بین عمل (meetual interaction) کے ذریعے "ہم آہنگی" کا جذبہ تقویت پاتا ہے۔ قبائلی سماجوں میں "ہم آہنگی" کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی خانہ بدوش ہوتی ہے جس کا انحصار باہمی تعاون پر ہوتا ہے۔ صحرا کی بے مایہ زندگی ان میں جائیداد یا ملکیت کے حصول کا خیال پیدا نہیں کر سکتی اس لیے کہ ہر ملک کو وہ اپنا ملک سمجھتے ہیں جس کا اثر ان کے کردار میں بھی نمایاں رہتا ہے۔

اس لحاظ سے ابن خلدون کا سماجی فلسفہ نہایت واضح اور سلجھا ہوا ہے۔ ابن خلدون کے بعد اطالوی مفکر جی بی۔ ویکو (Giovanni Battista Vico 1668–1747) اور فرانسیسی مفکر چارلس مانٹیسکو (Charles Mantesquieu 1689–1755) نے سماجی امور کے بارے میں کافی مواد اکٹھا کیا، لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں تھامس ہابس (Thomas Hobbes 1588–1670)، جان لاک (John Locke 1632–1704)

کا نظریۂ "سماجی معاہدہ" "Social Contract" جو انسانی فطرت کی بنیادی خصوصیتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا تھا وہ افراد اور افراد درمیان اور مملکت کے مابین پائے جانے والی بندھنوں کی نشان دہی کرتا ہے لیکن انسانی تعلقات کی نوعیت کو واضح طور پر پیش کرنے کا سہرا فرانسیسی مفکر اگست کونت (Auguste Conte 1798-1857) کے سر ہے، جس نے سماج کے سائنسی مطالعہ کے لیے 1830ء میں "سماجیات" کی اصطلاح ایجاد کی اور جس نے سماجی مظاہر کے لیے مشاہدے اور درجہ بندی (classification) کو ضروری سمجھا۔ کونت کی دو مشہور تصنیفیں "Positive Polity" اور "Positive Philosophy" ہیں جو 1830ء سے 1854ء تک کئی جلدوں میں شائع ہوتی رہیں۔ کونت کے سماجی تخیل کا سب سے منور پہلو "types of thinking" ہے جس میں وہ انسانی غور و فکر کے تین درجوں سے بحث کرتا ہے:

1۔ شئے پرستی Fetishism
2۔ کئی خدائیت Polytheism
3۔ اثباتیت Positivism

شئے پرستی کے دور میں انسان یہ سوچتا ہے کہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی فوق فطری قوت پوشیدہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جسے مذہب کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے نیچر پرستی "animism" اور روح پرستی یعنی "animatism" کہتے ہیں لہٰذا ہر چیز کی توجیہہ افسانوی طور پر کی جاتی ہے۔

جب انسان ہر شئے کی پرستش کرتے ہوئے تھک جاتا ہے تو وہ خداؤں کی تعداد گھٹا کر دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ انسانی غور و فکر کا کسی قدر ترقی یافتہ دور ہے جب کہ وہ مماثلت رکھنے والی تمام اشیاء کو ملا کر ایک خدا کا نام دیتا ہے۔ اس طرح کئی بڑے خداؤں (Great Gods) کا تصور پیدا ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک مختلف اشیاء اور واقعات کا نگراں ہوتا ہے۔

انسانی شعور کا تیسرا دور وہ ہے جسے کونت اثباتی یا سائنسی دور کہتا ہے جو کائنات کے بارے میں غور و فکر کرنے کا خالص استدلالی یا عقلی طریقہ ہے۔ اس دور میں انسان سنی سنائی روایتوں پر یقین نہیں کرتا بلکہ وہ سائنسی مشاہدوں پر مبنی حقایق کو استدلال کی کسوٹی پر جانچتا ہے۔

کونت کے بعد جن مفکّرین نے انگلستان اور امریکہ میں سماجیات کی داغ بیل ڈالی ان میں ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer 1820-1903) اور ایل۔ایف۔وارڈ (Lester F. Ward 1841-1913) قابلِ ذکر ہیں۔ سماجیات کی تاریخ میں اسپنسر کی شہرت "قانونِ ارتقاء" Law of Evolution اور عضویاتی تمثیل (Organic Analogy) کی وجہ سے ہے جس میں وہ سماج کا مقابلہ ایک حیاتیاتی عضویے سے کرتے ہوئے ان دونوں میں مشابہتوں اور عدم مشابہتوں کا ذکر کرتے ہوئے بالآخر سماج کو ایک فوق عضویہ (Super organism) قرار دیتا ہے۔

سماجی تحلیل میں وارڈ کا سب سے نمایاں تصور سماجی حرکیات یا Social dynamics کا ہے جس میں وہ چار اصولوں کا ذکر کرتا ہے۔

1۔ صلاحیتوں کا فرق	Difference of Potential
2۔ ایجاد	Innovation
3۔ قوتِ ارادی	Conation
4۔ سماجی ٹیلیسس	Social telesis

صلاحیتوں کے فرق کی وجہ سے سماج میں تنوع نظر آتا ہے جس کی وجہ سے ترقّی کے لیے اَن گنت راہیں کھل جاتی ہیں۔ صلاحیتوں کے فرق کی وجہ سے ذہنی ٹکراؤ بھی پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ ایجادوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر نئے خیالات اتفاقی طور پر ظاہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پرانے خیالات میں رد و بدل ہوتا ہے یا انھیں بالکل غلط ٹھہرایا جاتا ہے۔

وارڈ کے تیسرے ترکیباتی اصول (dynamic Principle) کا تعلق انسانی ارادوں اور کوششوں سے ہے جس کی بنا پر وہ خواہشوں کی تکمیل اور زندگی کی بقاء کے لیے اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں میں رد و بدل کرتا رہتا ہے۔ انسانوں میں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کی خواہش پائی جاتی ہے وہی سماجی ترقّی کے لیے راہیں متعین کرتی ہے۔ غرض "Conation" کی اصطلاح انسان کی اس لگاتار جد و جہد پر حاوی ہے جس کی بنا پر وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کرتا ہے اور بالواسطہ طور پر اس کی یہ جد و جہد سماج کی خوشحالی کا باعث بنتی ہے۔

وارڈ کا چوتھا مرکباتی اصول جس پر انفرادی اور سماجی خوشحالی کا دار و مدار ہے وہ

"Social telesis" ہے۔جس کی بنا پر انسان اپنے جذبوں اور خواہشوں کو صحیح راہوں پر ڈال سکتا ہے۔ورنہ انسان جہالت، غربت اور لاتعداد مشکلوں سے دوچار رہے گا۔جب سماج کے افراد اپنی فکری صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعاونِ عمل کے ذریعے مشترک مقاصد کو حل کرنے کی فکریں لگے رہتے ہیں تو وہ دُنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔

وارڈ کے بعد گبرئیل تارد (Gabriel Tarde) نے "تقلید" کو سماجی تعلقات کی بُنیاد اور سماجی برتاؤ کا ماخذ قرار دے کر، گمپلوکس (Gumplowics) اور راٹسن ہوفر (Ratsenhofer) نے "تصادم" اور "مفادات" کو سماج اور سماجی برتاؤ کی بُنیاد سمجھ کر، البرٹ شافلے، رینے ورمس (Albert Schaeffle Rene warms) نے سماج کا حیاتیاتی عضویے سے سمبندھ جوڑ کر سماجیات کی تاریخ میں نمایاں اضافہ کیا۔سمنر (Sumner) کی کتاب "Folkways" سماجیات کی ایک کلاسیکی کتاب سمجھی جاتی ہے جس میں وہ "folkways" اور "Mores" کا فرق واضح کرتا ہے۔عوامی طریقوں یا "folkways" کو سمنر رول، پیشوں، گروہوں، مذہبوں اور فرقوں کی بُنیاد قرار دیتا ہے اور "گروہی ہم آہنگی" کی اساس بھی یہی عوامی طریقے ہوتے ہیں۔ سماجی ادارے دراصل عوامی طریقوں اور "Mores" کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

سماجی برتاؤ کے متعلق قابلِ بھروسہ مواد جمع کرنے اور اس سے عام نتائج اخذ کرنے کا سہرا ایک فرانسیسی مفکر امائیل درکائیم (Emile Durkheim) کے سر ہے جس کی کتاب "Suicide" سماجیات کی پہلی سائنٹفک کتاب سمجھی جاتی ہے۔وہ خودکشی کی تین قسمیں بتاتا ہے:

1- ALTRUISTIC : گروہ کی بھلائی کی خاطر افراد جان پر کھیل جاتے ہیں مثلاً غازی۔

2- EGOISTIC : جب کہ سماجی تنظیم ناقص ہو اور فرد فرار اختیار کرنے کے لئے خودکشی کو ترجیح دیں۔

3- ANOMIC : جب کہ سماجی مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو اور جو معاشی بحران کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور سماجی طبقوں کے زوال کا باعث بھی۔غرض یہ صورتِ حال سماجی ہم آہنگی کی تضادی نوعیت ہے جب کہ مکمل ابتری پھیلی ہوئی ہو، عدم تحفظ ہو اور کسی قسم کے اقدار کی پابندی باقی نہ رہے۔

ورکائم کے بعد جارج سمل (George Simmel) اور لیوپولڈ وان ویزے (Leopold van Wiese) نے سماجی طریق، تمدنی ربط چھوٹی کمیونیٹیز (Small commu-nities) پر سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کی۔ ماکس ویبر (Max Weber) نے بنی نوع انسان کی عظیم تہذیبوں کا مطالعہ کیا تاکہ ان میں بنیادی طور پر جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا مطالعہ کیا جاسکے، اور فرڈیننڈ ٹوئنیز (Ferdinand Tonnies) نے جرم، شہریت، عوامی رایوں کے بارے میں کافی مواد اکٹھا کیا۔

امریکی سماجیات میں سب سے نمایاں حیثیت چارلس ہرٹن کولی (Charles Horton Cooley) کی ہے جس نے "Looking-Glass self" کے نظریہ کو سماجیت کے طریق کی بنیاد قرار دی جس کی بناء پر سماجی شعور کی نشوونما ہوتی ہے۔ کولی کے ہمعصروں میں البیون اسمال (Albion Small) نے "سماجی طریق" ایف۔ ایچ۔ گڈنگز (F.H. Giddings) نے "Censciousness of Kind" ہم جنسی شعور اور ای۔ اے۔ راس (E.A. Ross) نے "سماجی کنٹرول" پر سیر حاصل بحث کی۔ "سماجی طریق" یعنی "Social Processes" پر سب سے بسیط تحقیق رابرٹ ای پارک اور ایرنسٹ۔ ڈبلیو۔ برجیس (Robert E. Park & Ernest W. Burgess) کی ہے۔

ڈبلیو۔ ایف۔ اگبرن اور ایم۔ ایف۔ نمکاف (William Fielding Ogburn & Meyer F. Nimkoff) کا تعلق اجتماعی کرداریت کے دبستان (Plaralistic behaviorism School) سے تھا جن کا نام "سماجی تبدیلی" پر عمیق تحقیق کرنے کی وجہ سے بجا طور پر پوری دنیا میں مشہور رہے۔ ان دونوں مفکرین کی تحریروں میں جو نمایاں عنصر ہے وہ یہ کہ یہ دونوں مفکرین مادی تمدن (Material culture) اور مطابقتی تمدن (adaptive culture) میں فرق بتلاتے ہیں۔ مادی تمدن جیسے آلات و اوزار میں میکانی طریقوں کی وجہ سے جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ خوش آئند سمجھی جاتی ہیں۔ اور لوگ تمدن کے اس شعبے میں تبدیلیوں کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ جب کہ مطابقتی تمدن کا تعلق تمام سماجی اداروں سے ہوتا ہے، لہٰذا رکاوٹیں بہت زیادہ پیش آتی ہیں۔ ذاتی مفادات سماجی تبدیلی کی رفتار کو اور بھی کم کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگبرن نے "Cultural lag" کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔

نمکاف نے اگبرن کے ساتھ مل کر بھی کتابیں لکھی ہیں اور علاحدہ بھی۔ اُنھوں نے

"The Family & Marriage" پر بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ موجودہ زمانے میں سائنس کی ایجادوں اور صنعت وحرفت کی ترقی کی وجہ سے خاندان کی ساخت اور فعلیت پر بڑے دُوررس اثرات ترتّب ہوئے ہیں۔

سماجی کرداریت (Social behaviorism) کے دبستان سے تعلق رکھنے والے مفکّرین نے سماجی ایکشن "Social action" کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے جن میں ماکس ویبر (Max Weber) جان۔ آر کامنس (John R. Commans) رابرٹ ایم میکاور (Robert Morrison Mac Iver) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام ٹالکٹ پارزن (Talcott Parsons)، رابرٹ کے مرٹن (Robert. K. Merton) کے ہیں جنھوں نے سماجی عمل کے نظریہ "Social action Theory" پر کافی تفصیل کی ہے۔ "ایکشن" یا عمل کے بُنیادی جز و خیالات، خواہشات اور قدریں ہیں۔ ان مفکّرین کے پاس سب سے واضح تصوّر سوشیل سسٹم کا ہے جس کی ابتدائی اکائیاں رول، حیثیت، اور پوزیشن ہیں۔ سماجی اداروں میں بہت زیادہ اہم حصّہ سماجی قدروں کا ہوتا ہے۔ ان مفکّرین نے اداروں کی تقسیم تین طرح سے کی ہے۔ (۱) relational: جس میں افراد کے اعمال باہمی توقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ (2) regulative: جس میں اقدار پر زور دیا جاتا ہے اور تیسرے تمدّنی یا Cultural۔

سماجیات کی تاریخ میں ایک اور دبستان بہت اہمیت رکھتا ہے جو فعلیت یا "Functionalism" کہلاتا ہے۔ اس دبستان کی دو شاخیں ہیں:

1. Macro functionalism (large-scale social system)
2. Micro functionalism (small-scale social system)

جو مفکّرین سماجی سسٹم کے لیے بڑے گروہوں کا انتخاب کرتے ہیں ان کا تعلق پہلے دبستان سے ہوتا ہے جن میں ویلفیرڈو پریٹو (Vilfredo Pareto) نے داخلی اور خارجی سسٹم (internal & external) کے تصور کو فروغ دیا اور سنیکی (Znaniecki) نے "Closed system" کے تصوّر پر روشنی ڈالی۔ اس دبستان کے نمایاں تصوّرات پر رابرٹ مرٹن (R. Merten)، ٹالکٹ پارزن (Talcott Parsons)، جارج ہومنس (George Homans) میرن لیوی (Marion Levy)، شیل (Shils) اور بیلس (Bales) نے بہت زیادہ کام کیا۔

بہرحال فعلیت کے دبستان سے تعلق رکھنے والے مفکّرین چاہے بڑے سماجی سسٹم کا مطالعہ

کریں یا چھوٹے سماجی سسٹم کا ابھی ان دونوں دبستانوں میں اضافے اور ریسرچ کی کافی گنجائش ہے۔

سماجیات میں تحقیق کے طریقے : METHODS of SOCIOLOGY :

ہر علم میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے سائنٹفک طریقوں سے مدد لی جاتی ہے چاہے وہ طبعی علوم ہوں یا سماجی۔ چونکہ ہر علم کا نفسِ مضمون جُداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے اور ہر تحقیق کرنے والے کی دلچسپی مخصوص موضوع سے ہوتی ہے اس لیے موضوع کی نوعیت کے مطابق سائنسی طریقوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ سائنٹفک طریقوں کی تعریف لنڈبرگ (Lundberg) نے اس طرح کی ہے:

"Scientific method consists of systematic observation, Classification and interpretation of data. The main difference between our day to day generalisation and the Conclusions usualley recognized as scientific method lies in the degree of formality, rigorous ness, verifiability and general validity.

یعنی "سائنسی طریقہ منظم مشاہدوں، درجہ بندی اور مواد کی ترجمانی پر منحصر ہے۔ سائنسی طریقوں اور ہمارے روزمرہ کے بیانوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ سائنسی طریقوں میں ضابطہ واریت، معقولیت اور توثیق کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

یوں تو سائنسی اصولوں کا اطلاق آفاقی (universal) نوعیت کا حامل ہوتا ہے لیکن علوم کی نوعیت کے لحاظ سے اطلاق میں فرق نظر آتا ہے طبعی علوم میں جتنی قطعیت پائی جاتی ہے اتنی سماجی علوم میں ممکن نہیں۔ اس لیے طبعی علوم سے متعلق مواد کی جس آسانی سے توثیق اور تصدیق ممکن ہے اتنی صحت سماجی علوم میں نہیں پائی جاتی کیونکہ سماجی مظاہر اضافی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس قطعیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پانی کا درجۂ حرارت صفر ہوجائے تو وہ برف میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس قطعیت سے کسی بھی سماجی مظاہر کے بارے میں رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔

سماجی علوم میں مواد دو ماخذوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

1۔ تحریری ماخذ Documentary Sources

2۔ فیلڈ ماخذ Field Sources

ریسرچ کے لیے مواد حاصل کرنے کا اہم ذریعہ تحریری یا دستاویزی ماخذ ہے جس میں (1) کتابیں (2) سروے کی رپورٹ (3) تذکرے (خود نوشت تذکرے، سوانحِ حیات) (4) سفرنامے، تاریخی واقعات (5) مطبوعہ سرکاری مواد (6) غیر مطبوعہ مواد شامل ہے۔

کتابوں کے ذریعے جو مواد حاصل ہوتا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ تحقیق کو کس فہم سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہوسکے تکرار سے گریز کر کے یا تو پُرانے نظریوں میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے یا پُرانے نظریوں کی افادیت باقی نہ رہنے کی وجہ سے نئے نظریے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے وقفہ وقفہ سے سماجی مسائل سے متعلق سروے کی رپورٹ شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کا مواد بھی تحقیق کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ شائع کروانے والے ادارے قابلِ بھروسہ ہوں۔

تذکروں میں بہت زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔ ان میں خود نوشت سوانحِ حیات، تاریخی واقعات، خطوط، ڈائریاں، روزنامے وغیرہ شامل ہیں جن کے ذریعے متعلقہ مواد حاصل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

انسانیات پر تحقیق کرنے میں سفرناموں کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مختلف ملکوں کے سماجی حالات، مختلف سماجی گروہوں کے رسم و رواج، قبیلوں کے حالاتِ زندگی وغیرہ کا اندازہ سفرناموں سے ہوتا ہے۔

سماجی امور پر تحقیق کرنے میں تاریخی مواد بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ موجودہ سماجی امور کے متعلق صحیح نتیجے اخذ کرنے میں گذشتہ واقعات سے بہت مدد ملتی ہے۔ کسی بھی سماجی مسئلے کی گہرائی کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کا مقابلہ پچھلے زمانے سے کیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر جُرم کا سنگین مسئلہ ہمارے پیشِ نظر ہے تو اس کی صحیح تصویر ہمارے سامنے اس وقت آتی ہے جب کہ پچھلے زمانے سے اس کا مقابلہ کیا جائے کہ اس زمانے میں جُرم کی مختلف شکلیں کیا تھیں؟ شرحِ جُرم کیا تھی؟ اس مسئلے کے پیدا ہونے کے اسباب کیا تھے؟ اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کی گئی تھیں اور اب موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟

اکثر ملکوں میں سماجی امور اور سماجی مسئلوں سے متعلق وقفہ وقفہ سے حکومت مواد شایع کرتی رہتی ہے۔ یہ اعداد آبادی، شرح پیدائش، شرح اموات، شرح بقا، شرح صحت، شرح تعلیم، شرح جرم، اور شرح بے روزگاری وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ غرض ہم کو جس قسم کا بھی مواد حاصل کرنا ہوتا ہے اس سے متعلقہ مواد اسٹیٹ اور سنٹرل گورنمنٹ کی طرف سے مطبوعہ کتابوں میں مل جاتا ہے۔

ان مطبوعہ ریکارڈ کے علاوہ غیر مطبوعہ ریکارڈ بھی کافی تعداد میں پایا جاتا ہے جو سرکاری فائلوں میں دبا رہتا ہے۔ اگر ایسے مواد کا پتہ چل جائے جو ریسرچ کے کام آسکتا ہے تو پھر تحقیق کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

کسی موضوع پر تحقیق کرنے کے یہ بالواسطہ یا indirect طریقے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مواد حاصل کرنے کے لیے چند براہ راست طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن میں سے یہ چند اہم ہیں۔

1. مشاہدے — Observation
2. سوالیات — Guestionnaire
3. انٹرویو — Interview
4. شیڈول — Schedule
5. شماریاتی طریقے — Statistical Measures

مشاہدہ: OBSERVATION

گوڈ اور ہاٹ (Goode & Hatt) نے بڑی اچھی کتاب "Methods in Social Research" پر لکھی ہے جس میں انہوں نے مشاہدے کے بارے میں لکھا ہے کہ

"Science begins with observation & must ultimately return to observation for its final validation."

یعنی "سائنس کی ابتدا مشاہدہ سے ہوتی ہے اور توثیق کی خاطر پھر اسے مشاہدے کی طرف لوٹ کر آنا پڑتا ہے"۔

سائنسی تحقیق کے سلسلے میں مواد اکٹھا کرنے کا سب سے ابتدائی طریقہ مشاہدوں پر مبنی رہا ہے۔ زندگی کی ابتدا ہی مشاہدہ سے ہوتی ہے جب کہ بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے اطراف و اکناف بڑی عجیب و غریب چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ بہرحال چاہے بچہ ہو، جوان یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت سب کے تجربات اور احساسات بڑی حد تک ذاتی مشاہدوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

مشاہدے کی دو قسمیں ہوتی ہیں

1۔ اشتراکی مشاہدہ Participant observation

2۔ غیر اشتراکی مشاہدہ Non-Participant observation

جب فرد یا افراد کسی گروہ کے مشاغل میں حصہ لیتے ہیں اور ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں تو ایسے مشاہدوں کو اشتراکی مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی حیدرآباد کے بنجاروں سے متعلق مواد اکٹھا کر رہا ہے اور وہ جس وقت ان سے ملنے جاتا ہے اس وقت وہ لوگ ناچ گانوں میں مصروف ہیں تو بجائے حیرت یا استعجاب کا مظاہرہ کرنے کے اس وقت تالیاں بجانے لگے یا کوئی ایسے حرکات و سکنات سے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ وہ ناچ گانوں سے محظوظ ہو رہا ہے تو بعد میں چل کر ان کے دوسرے سماجی اداروں سے متعلق کھلی بات چیت کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے تہواروں اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں شریک ہونے سے وہ ان لوگوں میں یہ احساس پیدا کر واسکتا ہے کہ وہ ایک اجنبی نہیں ہے جو تماشائی کی حیثیت سے اس جگہ موجود ہے بلکہ اس گروہ کا ایک ہمدرد فرد ہے۔ غرض اشتراکی مشاہدہ میں تنقید کا جز مخفی رہتا ہے۔

اشتراکی مشاہدے کے کئی فائدے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ کسی مخصوص گروہ کا مشاہدہ اس کے اصلی روپ میں ممکن ہو جاتا ہے۔ اس پر تصنع غالب نہیں رہتا۔

اشتراکی مشاہدے کی وجہ سے گروہ سے قربت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے مخصوص گروہ سے متعلق بہت اچھی واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

کسی مخصوص گروہ کے مختلف مشاغل میں حصہ لینے کی وجہ سے اس کے سماجی اداروں کی ساخت اور فعلیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کے موقعے بڑھ جاتے ہیں۔ قربت کی بنا پر افراد کھل کر بات چیت کرتے ہیں۔ انھیں اپنے سماجی اداروں کے بارے میں صحیح معلومات دینے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔

اس قسم کے مشاہدوں کے چند نقصانات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی فرد کسی گروہ

کے ساتھ بہت زیادہ گھل مل جائے تو پھر Objectivity کا عنصر یا تو مدھم پڑ جاتا ہے یا باقی نہیں رہتا۔ ممکن ہے وہ اس گروہ کا تنقیدی جائزہ نہ لے سکے اور تحقیق کرنے والے کے دل میں ایک ایسا احساس اجاگر ہو جائے کہ وہ اس گروہ کی خامیوں کو ٹھیک طور سے قلمبند نہ کر سکے گا۔

اشتراکی مشاہدہ کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ جانبداری سے کام لے کر حالات اور واقعات کی صحیح عکاسی نہ کر سکے جس کی وجہ سے اس کی تحریر میں جانبداری کا عنصر نمایاں ہو جائے۔

اشتراکِ عمل کی وجہ سے گروہی نزاعوں اور جھگڑوں میں اُلجھنا ممکن ہو سکتا ہے جس کی بناء پر اسی گروہ کے دوسرے افراد کی نظر میں وقعت گر سکتی ہے۔ اس قسم کی حیثیت کے پیدا ہونے کی وجہ سے کام کی نوعیت متاثر ہوتی ہے۔

بعض صورتوں میں اشتراکی مشاہدہ ممکن ہی نہیں ہے جیسے مجرموں کا جتھا اور قیدی۔

غیر اشتراکی مُشاہدہ :

جب محقق گروہ کے مشاغل میں حصہ نہیں لیتا بلکہ ایک موزوں فاصلے سے ان کی روزانہ زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ غیر اشتراکی مشاہدہ کی صورت ہو گی۔ لیکن دیکھا جائے تو کبھی بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ فرد کسی گروہ پر تحقیق کے لیے مواد اکٹھا کرے اور خود ایک اجنبی کی طرح دُور سے ان کے واقعاتِ زندگی کو لکھتا جائے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض مشاغل میں بہت زیادہ حصہ لے اور بعض میں کم۔

اس قسم کے مشاہدے کے یہ فائدے بیان کیے جاتے ہیں کہ متعلقہ فرد اپنے آپ کو بڑی حد تک غیر جانبدار رکھ سکتا ہے۔ اس میں غیر شخصی عُنصر باقی رہتا ہے۔ وہ تعصب سے کام نہیں لیتا۔ بعض صورتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ کھُل کر اپنے سماجی اداروں کی خامیوں کے بارے میں بات چیت کریں کیونکہ وہ ایک اجنبی رہتا ہے اور عام طور سے لوگ اجنبیوں کے ساتھ زیادہ کھُل کر اپنی کمزوریوں کو بیان کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ وہ معمولی سے معمولی چیزوں کا بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

اگر اس گروہ میں لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں تو وہ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور کسی بھی فرد یا گروہ کی طرف داری میں نہیں اُلجھتا۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے ریسرچ کا کام

متاثر نہیں ہوتا۔

اس طریقے کے کئی نقصانات بھی ہیں۔ گروہ کی سماجی زندگی سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے وہ کوئی رسوم و رواج، عقائد اور توہمات وغیرہ کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کر سکتا اور نہ اس مخصوص گروہ میں ان کی اہمیت اس پر واضح ہونے پاتی ہے اور نہ وہ اس بارے میں تفصیلی طور پر پوچھ تاچھ کر سکتا ہے۔

لوگ عام طور سے اجنبیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے برتاؤ میں وہ اصلیت باقی نہیں رہتی جو جزو زندگی ہے بلکہ ان کے رہن سہن، طرز برتاؤ اور بات چیت پر تصنع غالب آجاتا ہے۔ اس لحاظ سے محقق کے سامنے زندگی کا صحیح رُخ نہیں آنے پاتا بلکہ ایک رسمی اور بناوٹی رُوپ۔ ایسی حالت میں نہ تو محقق اپنے آپ کو سکون کی حالت میں پاتا ہے اور نہ گروہ۔ دونوں پر ایک قسم کی بے چینی اور بے لطفی طاری رہتی ہے۔

سوالیات : QUESTIONNAIRE

جب ریسرچ کے لیے موضوع کا انتخاب ہو جاتا ہے تو اس موضوع سے متعلق ایسا سوالیات تیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے ذریعے مواد اکٹھا کیا جاسکے سوالیات کی تیاری میں چند اہم امور پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔

1 ۔ سوالات کا سائز: اگر سوالوں کی ایک لامتناہی فہرست ہے تو جواب دینے والوں کو بیزارگی ہونے لگتی ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے کم سے کم سوالوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔

2۔ سوالیات کو جاذب نظر ہونا چاہیے، لہٰذا اس کی چھپائی اور کاغذ اچھا ہونا چاہیے اور جس مقصد کے لیے یہ سوالات پوچھے جارہے ہیں اس کا اظہار صاف طور پر ہونا چاہیے۔ اگر اس ریسرچ اسکیم کو گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل ہے تو بہتر ہے کہ اس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

3 ۔ سوالوں کو ترتیب دینے پر خاص طور سے توجہ کی جائے۔ سوالوں میں تسلسل باقی رہنا چاہیے اور انھیں بامعنی ہونا چاہیے سلیس زبان کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو سوال کے سمجھنے میں دقت یا اُلجھن نہ ہو۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ چند لوگوں پر ان سوالوں کی مشق کروالی جائے تاکہ اس میں جو نقص ہیں وہ دُور کر دیے جاسکیں۔ اگر ضرورت پڑے

تو بار بار بھی مشق کروائی جاسکتی ہے۔

۔ جہاں تک ہوسکے سوالوں کو دلچسپ بنایا جائے تاکہ جواب دینے والوں کو بھی شروع سے آخر تک دلچسپی باقی رہے۔ دلچسپی کا سوال بڑی حد تک ریسرچ کے موضوع پر مبنی ہے اور اس ادارے کی ساکھ پر جس نے اس ریسرچ کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ان چند عوامل کا ذکر بھی ضروری ہے جس سے سوالوں کے جواب دینے کی نوعیت پر اثر پڑتا ہے مثلاً جنس، عمر، معاشی حیثیت، تعلیمی معیار وغیرہ۔ لوگ عام طور پر ان سوالوں کا جواب دینے سے بیزارگی کا اظہار کرتے ہیں جو شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں یا جو ادارہ یا فرد تحقیق کر رہا ہے اس کی شخصیت مشکوک نظر آتی ہے۔ عام طور پر ایسے سوالوں کا جواب دینے میں لوگ تکلیف نہیں محسوس کرتے جن کا تعلق براہِ راست ان سے ہو اور وہ ریسرچ کرنے والے سے کچھ واقفیت رکھتے ہوں۔ واقفیت کی وجہ سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور ہمدردی کی وجہ سے کام سے دلچسپی۔

اگر سوال آسان، دلچسپ، مختصر اور سلسلہ وار ہوں تو دلچسپی کا عنصر اور بھی بڑھ جاتا ہے اس کے برخلاف اگر سوال طویل، غیر دلچسپ، اُلجھے ہوئے، مشکل زبان میں لکھے ہوئے ہوں تو چند سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ نامکمل چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اکثر یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ اگر سوالات دلچسپ ہوں تو سوالات کے طویل ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ عام طور پر سوالات کی ابتدا سے پہلے ایک کاغذ منسلک کر دیا جاتا ہے جس میں جواب دینے والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے وہ صحیح جواب دینے کی کوشش کریں ریسرچ کے مقصد کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت بتائی جاتی ہے اور اس سے جو فائدے ہوسکتے ہیں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ استدعا مختصر اور با اثر طریقے پر کی جائے تو بہتر موزوں جوابوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

جب ٹپہ کے ذریعے سوالیات روانہ کیے جاتے ہیں تو عام طور سے جواب ملنے میں تاخیر ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھا جائے کہ سوالات فردِ متعلق کو چھٹیوں میں مل جائیں تو پھر وہ سہولت سے جواب دے سکتا ہے۔ اگر ہفتے کے شروع میں بھیجا جائے تو پھر ان سوالات کا misplaced ہوجانا کوئی قرینِ قیاس نہیں۔ ان امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر سوالات کے وصول ہونے میں دیر ہوجائے تو دو ہفتوں کے بعد یاددہی کروائی جاسکتی

ہے۔اس کے باوجود جواب نہ آئے تو پھر ایک ہفتے کے بعد دوسری دفعہ یاد دہی کروانی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جواب دینے والے پر postage کا بار نہ پڑے۔

انٹرویو: INTERVIEW

سماجی امور پر تحقیق کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ نہ صرف مشاہدے کی بنا پر مواد اکٹھا کیا جاتا ہے بلکہ کسی موضوع کے بارے میں افراد سے بات چیت کر کے اس کے خیالوں، احساسوں اور جذبوں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ انٹرویو کا طریقہ ایک ٹیپ ریکارڈر کی طرح ہوتا ہے جس میں پہلی باتوں، واقعات، حالات، احساسات اس کی پسند اور ناپسند امور کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ انٹرویو کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

1. Structured Interview
2. Unstructured Interview
3. Focused Interview
4. Repetitive Interview

پہلے قسم کے انٹرویو کو راست، guided اور controlled انٹرویو کہا جاتا ہے۔ انٹرویو لینے والے فرد سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کے ذمے جو سوالات کی فہرست کی گئی ہے صرف اس حد تک جواب طلب کرے۔ خود اپنے سے کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرے۔

دوسرے قسم کا انٹرویو اس کی برعکس نوعیت کا ہوگا۔ سوالات کا پہلے سے تعین نہیں کیا جاتا بلکہ انٹرویو لینے والے سے کہا جاتا ہے کہ چند مختص موضوعوں پر معلومات حاصل کرے۔ اس قسم کے انٹرویو عام طور پر کہانی کی نوعیت اختیار کرتے ہیں۔ متعلقہ شخص سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے حالات، احساسات اور تجربے بیان کرے جس کی بنا پر نتیجے اخذ کیے جاتے ہیں۔

تیسرے قسم کے انٹرویو کی نوعیت ان دونوں سے جداگانہ ہوتی ہے۔ کسی خاص موضوع کی نوعیت کے بارے میں سوالات کیے جاتے ہیں تاکہ اس مخصوص موضوع یا مسئلے کے بارے

میں شخصی رُجحانوں اور جذبوں کا پتہ چلایا جا سکے۔

چھوٹے قسم کے انٹرویو میں کسی سماجی یا نفسی طریقہ Process کے شرکت کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی گاؤں میں ایک ایسی سڑک بنائی گئی ہے جو شہر سے منسلک ہوتی ہے تو ظاہر ہے اس کا اثر لوگوں کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔ یہ اثر فوری تو نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثرات آہستہ آہستہ معاشی حیثیت، معیارِ زندگی، رُجحانوں ورایوں اور لوگوں کے باہمی تعلقات پر مرتب ہوتے ہیں۔ ان اثرات کا پتہ چلانے کے لیے ہر تھوڑے وقفے سے لوگوں سے انٹرویو لیا جاتا ہے تاکہ تبدیلی کی رفتار کا اندازہ کیا جا سکے۔

شیڈول : SCHEDULE

سماجی سروے میں عام طور پر شیڈول اور سوالات کے ذریعے مواد اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ان دونوں طریقوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ شیڈول کی خاصیت یہ ہے کہ انٹرویو لینے والا سوالات پوچھ کر ان کے جوابات خود لکھتا جاتا ہے اور سوالات (Questionnaire) متعلقہ لوگوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی سہولت کے مطابق ان کی تکمیل کر کے واپس کر دیں۔ شیڈول میں عام طور پر دو قسم کے سوالات ہوتے ہیں۔ ایک تو راست سوالات اور دوسرے جدول یا table کی شکل میں۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص سے اس کے پوسٹ کے بارے میں پوچھنا ہے تو اس سے یا تو راست سوال کیا جا سکتا ہے کہ "آپ کے پوسٹ کی نوعیت کیا ہے؟ یا پھر ایک جدول یا table اس موضوع پر بنایا جا سکتا ہے" پوسٹ کی نوعیت !!

شیڈول کو عام طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ تمہیدی Introductory

2۔ اصل شیڈول Main schedule.

3۔ انٹرویو لینے والے کے لیے ہدایتیں Instructions for the interviewer

تمہیدی حصے میں عام طور پر اس قسم کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

1: سروے کا موضوع اور تحقیق کرنے والے کا نام۔

2: شمارہ نمبر یا کیس نمبر

3: نام، پتہ، عمر، جنس، پیشہ، تعلیم وغیرہ۔

4 : انٹرویو لینے کا مقام

5 : انٹرویو کی تاریخ اور وقت

شیڈول کا دوسرا حصّہ بہت اہم ہوتا ہے جس میں سوالات اور خانہ پُری کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ سوالات واضح، آسان اور مختصر ہونے چاہیے۔

انٹرویو لینے والے کے لیے تحریری ہدایتوں کا ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ گو ریسرچ کا مقصد اور شیڈول کی نوعیت کافی وضاحت کے ساتھ سمجھا دی جاتی ہے پھر بھی بھُول کا احتمال رہتا ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ انٹرویو دُور دراز مقام پر لیا جا رہا ہے۔ اگر شیڈول میں کوئی خالص علمی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں تو ان کی تشریح بھی کر دینی چاہیے تاکہ انٹرویو لیتے وقت اور جوابات کی خانہ پُری کرتے وقت معنی مفہوم میں فرق نہ پیدا ہو جائے

سوالات کی نوعیت بھی جُداگانہ ہوتی ہے مثلاً۔

1. *Open end questions.*
2. *Structured questions.*
3. *Dichotomous questions.*
4. *Multiple choice questions.*
5. *Leading questions.*
6. *Ambiguous questions.*
7. *Ranking item questions.*

پہلے قسم کی نوعیت کے سوالات کچھ اس طرح ہوں گے :

1 : موجودہ زمانے میں تعلیمی معیار کے پست ہونے کے کیا اسباب ہیں ؟

2 : آپ اس سلسلے میں کیا تجویز پیش کر سکتے ہیں ؟

دوسری نوعیت کے سوالات براہِ راست ہوں گے مثلاً آپ کی عمر کیا ہے ؟

تیسری نوعیت کے سوالات ایسے ہوں گے جس میں متبادل جوابات موجود ہوں گے جس میں سے کسی ایک پر نشان لگانا ہوگا:

1 : جنس۔ مرد/عورت

2 : کیا آپ کا تعلق درج فہرست ذات سے ہے۔ ہاں/نہیں

چوتھی نوعیت کے سوالات میں انتخاب کے کئی ذریعے متعین کر دیے جاتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی بھی پسند نہ آئے تو آخری ایٹم "دیگر" "others" کا رکھا جاتا ہے مثلاً

1: آپ کس قسم کا کیریئر پسند کرتے ہیں؟

(الف) تجارت

(ب) گورنمنٹ سروس

(پ) پرائیویٹ سروس

(ت) آزاد پیشہ

(ٹ) کوئی دوسرا Any other

پانچویں نوعیت کے سوالات اس قسم کے ہوتے ہیں:

1: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سرکاری مدرسوں میں پڑھنے کی وجہ سے بچوں میں نظم اور ضبط باقی نہیں رہتا؟

2: کیا آپ اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ نوکری کرنے کے مقابلے میں عورتوں کے لیے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی نگہداشت کریں؟

اس قسم کے سوالات پوچھنے سے عام طور پر احتیاط کی جاتی ہے تاوقتیکہ اس کی شدید ضرورت نہ پڑے کیونکہ اس میں شخصی عنصر زیادہ غالب رہتا ہے۔

چھٹی نوعیت کے سوالات وہ ہوتے ہیں جو مبہم ہوتے ہیں یا ان کے جوابات قطعی نہیں ہو سکتے مثال کے طور پر

(1) کیا آپ معاشی منصوبہ بندی کی تائید میں ہیں یا اسٹیٹ کنٹرول کی؟

سوالوں کی ساتویں نوعیت وہ ہوتی ہے جب کہ جواب دینے والوں سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ انتخاب کے سلسلے میں کس چیز کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر

(1) آپ کس پوسٹ کو ترجیح دیتے ہیں؟ ( )

(الف) انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس ( )

(ب) کسی تحقیقی ادارے کا ڈائرکٹر ( )

(پ) کسی عمدہ یونیورسٹی کا پروفیسر ( )

(ت) ہائی کورٹ کا جج ( )

(ٹ) کسی بڑے دواخانے میں ڈاکٹر ( ) ( )
مندرجہ ذیل سوالات پوچھنے سے گریز کیا جائے۔
طویل، پیچیدہ، شخصی، مشکوک، پریشانی یا اُلجھنوں میں ڈالنے والے، عام، غیر واضح اور مشکل۔

شماریاتی طریقے : STATISTICAL MEASURES

جب کسی موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے مواد جمع ہو جاتا ہے چاہے وہ مشاہدات کی بنا پر ہو، سوالات کے ذریعے یا انٹرویو اور شیڈول کا طریقہ اختیار کرنے سے۔ بہر حال اس جمع شدہ مواد کو ترتیب دینے کا سوال بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ ترتیب ہی کی بنا پر نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مواد جس طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کو "Classification" یا درجہ بندی کہا جاتا ہے۔ درجہ بندی کے ذریعے تمام مواد کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کی بنا پر بے ترتیب مواد کو سائنسی بُنیادوں پر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے ایک غیر منظم (Un organized) مواد کو بامعنی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔
Classification کی اساس "Unity among diversity" ہے۔
درجہ بندی کی عام طور پر دو نوعیتیں ہیں۔

1. Qualitative classification or Classification according to attributes.
2. Quantative classification or Classification according to variables.

یعنی (1) قسمی درجہ بندی۔ (2) مقداری درجہ بندی۔
قسمی درجہ بندی دو طرح کی ہوتی ہے:

1. Classification according to dichotemy.
2. Multiple classification.

پہلی قسم کی درجہ بندی میں صرف دو گروپ ہوتے ہیں مثلاً مرد اور عورت، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، ہندو اور مُسلم۔

کئی نوعی درجہ بندی میں کسی قسم یا quality کی بنا پر کئی گروہوں کی درجہ بندی ممکن ہے مثلاً طالب علموں کو شعبۂ آرٹس، شعبۂ سائنس، شعبۂ کامرس، شعبۂ قانون وغیرہ میں تقسیم کرنا۔
جب variables کے لحاظ سے درجہ بندی کی جاتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی، عمر، نمبر، محصلہ وغیرہ کے لحاظ سے کس طرح ترتیب ممکن ہے۔

جدول: TABULATION

جب تحقیق کے لیے مواد جمع ہو جاتا ہے اور اس کو ترتیب بھی دے دیا جاتا ہے تب اس کو جدول یا tables کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جدول کی وجہ سے تحقیق کا مطلب صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مواد کو بامعنی طور پر مختصر طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ تقابل آسان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر سنہ 1971ء کی آبادی سے متعلق مواد اکٹھا کرنا ہے تو ایک آسان جدول یا tables اس طرح بنایا جائے گا۔

سنہ 1971ء میں مختلف اسٹیٹ کی آبادی

اسٹیٹ	آبادی		
	مرد	عورت	جملہ
جملہ			

اس مختصر سے جدول سے مختلف اسٹیٹ کی جملہ آبادی۔ وہاں عورتوں اور مردوں کی جملہ تعداد کا تقابلی نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جب دو سے زیادہ عوامل کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے تو اس کو triple tabulation کہا جاتا ہے ۔ جس میں جملہ آبادی، جنس کی شرح اور تعلیم وغیرہ کا تقابلی نقشہ واضح طور پر سامنے آتا ہے مثلاً

اسٹیٹ	مرد			عورت			جملہ
	تعلیم یافتہ	غیر تعلیم یافتہ	جملہ	تعلیم یافتہ	غیر تعلیم یافتہ	جملہ	
جملہ							

جدول کی تیاری میں کافی احتیاط کرنی پڑتی ہے کیونکہ مواد کو ترتیب دینا یا جدول کی شکل میں پیش کرنا مہارت کا کام ہے ۔ جدول کی تیاری کا انحصار مواد کی سائز اور نوعیت پر ہوتا ہے ۔ ایک مکمّل اور عُمدہ جدول تیار کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔

ہر جدول کو ایک موزوں عنوان دیا جائے ۔ اس میں عام طور سے چار امور کی حرکت ہوتی ہے ۔ (1) جدول کا نفسِ مضمون کیا ہے ؟ (2) اس کا تعلق کس سن سے ہے ؟ (3) درجہ بندی کی اساس کیا ہے (4) کس ماخذ سے یہ جدول تیار کیا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر اس جدول پر نظر ڈالیے :

1971ء کے لحاظ سے مختلف اسٹیٹ کی آبادی

اسٹیٹ	عمر	مرد			عورت			جملہ
		تعلیم یافتہ	غیر تعلیم یافتہ	جملہ	تعلیم یافتہ	غیر تعلیم یافتہ	جملہ	
1: آندھرا پردیش	20 سال سے کم							
	20 تا 40							
	40 تا 60							
	60 سے اوپر							
	جملہ							
2: اترپردیش	20 سال سے کم							
	20 تا 40							
	40 تا 60							
	60 سے اوپر							
	جملہ							

مختلف طریقوں سے جدول کے کالموں کو ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے، محلوں کے اعتبار سے کہ محکمۂ بلدیہ کی طرف سے شہر کو کتنے حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کسی شہر میں زرعی پیداوار کی زیادتی کو ترجیح دیتے ہوئے۔

اگر کسی جدول سے متعلق کسی اہم نکتے کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کروانا ہے تو حاشیہ یا Foot note میں اسی کی تشریح کردی جائے۔ حاشیہ میں عام طور پر ماخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

سماجیات اور سماجی علوم

تاریخ اور سماجیات: HISTORY AND SOCEIOLOGY

وسیع معنوں میں تاریخ ایسا سماجی علم ہے جو ماضی کے واقعات کو سائنٹفک طریقے پر قلم بند کرتا ہے، جس سے انسانی نسل کی ابتدا، ارتقاء، عروج اور تنزل کا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن کئی تاریخ کے ماہرین محض دیرینہ واقعات کو قلم بند کرنے سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں جو کسی نسل کی ترقی اور تنزل کا باعث قرار دیے جاتے ہیں۔ اس طرح واقعات کی توجیہہ تاریخ کا ایک اہم فرض ہے۔

علم تاریخ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ بالکل ابتدائی تمدن سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی روایتوں، مذہبی تصوروں اور اخلاقی قدروں کو آنے والی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی رہائش گاہوں یعنی غاروں کی دیواروں پر انتہائی بھدّے طریقے پر کیوں نہ ہو مختلف لکیروں کے ذریعے اپنے کارناموں اور رہن سہن کی نشانیاں چھوڑی ہیں۔

سماجیات اور تاریخ میں گہرا تعلق ہے اس لیے کہ موجودہ سماج کی ساخت، فعلیت اور سماجی مسئلوں کو سمجھنے کے لیے ماضی کا نقشہ سامنے رہنا ضروری ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں حال کو سمجھنے اور مستقبل کی پیشین گوئی کے لیے ماضی کا مطالعہ اہم ہے تاکہ مسئلوں کی نوعیت اور ان کی پیچیدگی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ تاریخ کے سائنسی مطالعے سے فیصلے کی قوت میں توازن پیدا ہوتا ہے اور تاریخ کا سماجی پہلو بہتر اور مفید تر سماجی معلومات فراہم کرنے کا باعث ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آرنلڈ ٹوئین بی (Arnold Toynbee) کی کتاب "A Steedy of History" سماجیات کے مطالعے کے لیے بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ تاریخ اور سماجیات دونوں سماجی مظاہر کا مطالعہ کرتے ہیں مگر ان دونوں میں نقطۂ نظر کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مورّخ جنگ کی سرگذشت بیان کرتا ہے اور جنگ کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے لیکن سماجیات کے ماہران طریق (process) کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو جنگ کے رجحانوں کو ابھارنے، افراد اور گروہ کو جنگ کی طرف

اُکساتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سماجیات کے ماہروں کی دلچسپی محض ان امور کی چھان بین تک محدود نہیں رہتی کہ جنگ کب ہوئی؟ کس کے درمیان ہوئی؟ کب تک جاری رہی؟ اس جنگ کا کیا نتیجہ نکلا؟ بلکہ وہ جنگ اور انقلاب کا مطالعہ ایک سماجی مظہر کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں جو تصادم Conflict کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر کا فرق شخصیتوں کے مطالعہ میں بھی ظاہر ہوتا ہے یعنی مورخ اہم شخصیتوں کا مطالعہ ان کے کارناموں کی حیثیت سے کرتا ہے جب کہ سماجیات کا ماہر سماجی کنٹرول کے ذریعے کی حیثیت سے لیڈر شپ کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی طرح سماجیات اور تاریخ کے نقطۂ نظر کا بنیادی فرق واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ تاریخ ایک بیانی سماجی علم ہے اور سماجیات تجزیاتی یعنی Analy-tical۔

تاریخ اور سماجیات کے اس فرق کے باوجود ہماری زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ علمی ہو یا نظری سماجی ورثے کا مرہونِ منت ہے جو ہم نے اپنے پیشروؤں سے حاصل کیا ہے۔ ہمارے علوم اور فنون، موسیقی اور مصوّری، قانون اور سیاست، مدرسے اور یونیورسٹیاں، صنعت و حرفت اور تجارت اس منظّم اور تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں جس میں بے شمار افراد اور جماعتیں گذشتہ زمانوں میں حصّہ لے چکی ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں چھُپ گئیں۔ اس لحاظ سے یقیناً ہماری موجودہ پیڑی ان تمام گذشتہ پیڑیوں کے ترکے سے مستفید ہو رہی ہے جو ہم سے پہلے گزر گئیں۔ لہٰذا ہم اپنے تمدّن میں اضافہ اس جگہ سے کرتے ہیں جہاں سے گذشتہ پیڑی نے اسے چھوڑا ہے۔ اس لحاظ سے ہر بچّہ پچھلے تمدّن کا وارث ہوتا ہے۔ ہم ماضی کو ایک بوجھ سمجھ کر پھینک نہیں سکتے کیونکہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے، قلب اور دماغ میں سرایت کر چکا ہے جس کی بناء پر ہم روایتوں، مسلکوں اور رسم و رواج کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا، بلکہ حال کا ایک جُزو بن کر مستقبل کی تعمیر میں اہم حصّہ لیتا ہے۔ اب یہاں یہ اہم سماجیاتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سماجی ورثے کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح اور تفسیر اور ان کی حفاظت کے لیے صرف کریں یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاء پذیر تجربے کی بُنیاد رکھیں اور ان میں زمانے کے تقاضوں اور رُجحانوں کو مدِّنظر

رکھتے ہوئے ترمیم اور تبدیلی لائیں۔ بڑے سے بڑا فلسفی، موجد اور سائنس داں بھی پچھلی معلومات اور تجربوں سے فائدہ اُٹھاکر اپنے تحقیقی مواد کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے یا پچھلے ادب سے فائدہ اُٹھاکر ایسے قانون دریافت کرتا ہے جس کا اطلاق موجودہ زمانے میں ہوسکتا ہے۔ اس طرح ہر ایجاد میں متقدمین کا بڑا زبردست ہاتھ رہتا ہے۔

نفسیات اور سماجیات: PSYCHOLOGY AND SOCIOLOGY

نفسیات اور سماجیات میں انسانی افعال اور اعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ نفسیات میں فرد کے نفسی رُجحانوں اور کیفیتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو سماجیات میں سماج کے دوسرے افراد سے ربط میں آنے کی وجہ سے سماجی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا سائنسی نقطۂ نظر سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

نفس سے مراد وہ تمام خواہشیں، جبلتیں اور رُجحان شامل ہیں جو تمام جانداروں میں فطری یا اکتسابی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور جن پر انسان کے تمام مثبت اور منفی اعمال کا دارو مدار ہے۔ انسان کے نفسی رُجحانوں کی تعمیر و تشکیل میں سماجی گروہوں کا زبردست حصّہ ہوتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک انسان جن مختلف اداروں سے ربط میں آتا ہے وہ سب شخصیت ساز ہوتے ہیں۔ ایک متوازن شخصیت یا balanced Personality کی تشکیل مختلف اداروں سے مطابقت کرنے کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی فرد کے افعالی نمونوں کو دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس سماج کا پروردہ ہے۔

یہ ضرور ہے کہ نفسیات میں فرد اور سماجیات میں سماج پر زور دیا جاتا ہے لیکن فرد اور سماج دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ سماجیات کے اکثر و بیشتر موضوع جیسے سماجیات (Socialisation)، شخصیت (Personality)، خاندان، سماجی ادارے، مجمع (Crowd)، گروہ، سماجی کنٹرول وغیرہ جیسے خالص سماجی موضوع نفسیات کی ایک ذیلی شاخ سماجی نفسیات (Social Psychology) میں زیرِ بحث آتے ہیں۔

زندگی کا چاہے کوئی میدان ہو معیشت، تجارت، تعلیم، سیاست، تفریح اور مذہب

وغیرہ ہر ایک میں انفرادی اور اجتماعی نفسی کیفیتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ فرد اور گروہ کے نفسی رُجحانوں کا پتہ لگائے بغیر نہ تو پیدائش دولت ممکن ہے اور نہ ہی پیداشدہ دولت کی نکاسی۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے تشہیر ضروری ہے اور تشہیر یا پروپگنڈہ کے لیے ترغیبی اصولوں اور نفسی کیفیتوں کا جاننا ضروری ہے۔ افراد اور گروہ کے نفسی رُجحانوں کا پتہ لگانے سے تجارت میں بھی کامیابی ممکن ہے اور سیاست میں بھی۔ غرض معاشیات داں ہو یا تعلیم اور تفریح کا ماہر سب ہی اپنے نظام کی تشکیل اور پروگراموں کی عمل آوری میں افراد اور گروہ کے میلانوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر روزانہ استعمال میں آنے والی اشیاء جیسے صابن، پاوڈر، تیل، چائے، کافی ہارلکس وغیرہ سے متعلق وقتاً فوقتاً ایسا مواد اکٹھا کیا جاتا ہے جس سے افراد اور گروہ میں کسی خاص brand کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اندازہ ہوسکے۔ اس رُجحان کو جاننے کے بعد سنیما، اخبار، رسالوں وغیرہ میں ایسے دل لبھاؤ طریقوں سے پبلسٹی کی جاتی ہے کہ افراد کو ان اشیاء کے استعمال کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں علم نفسیات بہت زیادہ مقبول ہوتا جارہا ہے، کیونکہ ہماری سماجی زندگی کا ڈھانچہ تمام تر ہمارے نفسی رُجحانوں کی غمازی کرتا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کہ خداداد قناعت پسندی (divine Contentment) کا سہارا لے کر "چند روزہ دنیوی زندگی" میں فرد کی نفسی خواہشوں اور جبلتوں کو کچلنے کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ آخرت سنبھل جائے، لیکن موجودہ زمانے میں یہ فرسودہ فلسفہ ہے۔ آج کل بیشتر لوگ آخرت کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ دنیوی زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں۔ اس بدلتے ہوئے رُجحان کی وجہ سے ہر سماجی ادارے کے پیش نظر یہ مسئلہ رہتا ہے کہ مادیت اور لذتیت میں انسان اس طرح نہ پھنس جائے کہ سماجی نظام درہم برہم ہوجائے کیونکہ سماجی زندگی میں ہم آہنگی بنیادی قدروں کی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ نفسیات کی اہم شاخ انفرادی نفسیات میں فرد کے نفسی رُجحانوں اور کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نفسیات کی ایک اور اہم شاخ موجودہ زمانے میں اہمیت حاصل کررہی ہے وہ — Psychiatry ہے جس میں نظریوں کے علاوہ کلینکل (Clinical) پہلوؤں پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ جسمانی امراض کے ماہرین نے اپنی متعدد اور بیش بہا تحقیقوں سے اس امر کا پتہ چلایا ہے کہ تمام امراض کا تعلق محض جسمانی نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر امراض نفسی اور ذہنی الجھنوں کی وجہ سے

پیدا ہوتے ہیں۔ نفسیات کی اس شاخ میں افراد کے نفسی رُجحانوں کا پتہ چلا کر ان عنصروں کی چھان بین اور تجزیہ کیا جاتا ہے جو شخصی، خاندانی اور بالآخر سماجی زندگی میں انتشار پھیلانے کا باعث ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں انفرادی آزادی کا رُجحان چونکہ بہت زیادہ تقویت پا چکا ہے اس لیے ہر سماجی ادارہ ایسے عنصروں کا شکار ہے جس کی وجہ سے زندگی میں بے اطمینانی بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ میاں بیوی، بھائی بہن، والدین اور بچے، آفیسر اور ماتحت، آجر اور مزدور غرض ہر فرد ذاتی مفادوں کو پس پشت ڈال کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور، مظلوم اور محکوم سمجھتا ہے بلکہ ایک آزاد، قابلِ عزت فرد کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتا ہے ورنہ اس کی برعکس صورت خاندانی انتشار، ہڑتالوں، جنگ اور تصادم کی ہو گی۔ ان سماج دشمن عنصروں کے نتیجے بڑے دُور رس اور تباہ کُن ہوتے ہیں ایسے تمام موقعوں پر جب کہ افراد اور گروہ نفسی اُلجھنوں کا شکار ہوتے ہیں — Clinical Psychiatry بہت موثر ثابت ہوتی ہے۔

معاشیات اور سماجیات : ECONOMICS AND SOCIOLOGY

ایک زمانہ تھا جب کہ معاشیات کو دولت اور خوشحالی کا علم سمجھا جاتا تھا یعنی

"Economics is a science of wealth and welfare."

اس تعریف کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ معاشیات دولت پرستی سکھاتا ہے۔ یہ غلط فہمی دراصل تنگ نظری کا نتیجہ تھی اور اس مضمون کو سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ دولت کے بغیر نہ تو احتیاجات کی تکمیل ہو سکتی ہے اور نہ خواہشات پوری ہو سکتی ہیں۔ نہ مدرسے قایم ہو سکتے ہیں اور نہ مقدس مقامات کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ نہ ریلیں چل سکتی ہیں اور نہ ہوائی جہاز پرواز کر سکتے ہیں۔ نہ یونیورسٹیاں قائم ہو سکتی ہیں اور نہ حق و انصاف کی لڑائیاں لڑی جا سکتی ہیں مختصر یہ کہ تہذیب اور خوشحالی کا ڈھانچہ بڑی حد تک دولت پر قائم ہے، لیکن جس طرح محض ڈھانچہ بدن نہیں بنتا اور نہ بدن کا وجود جان کا ثبوت اور جان کا ثبوت صحت اور جانداری کی علامت ہے اسی طرح دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ البتہ دولت بھی ضروری ہے تاکہ انسان احتیاجوں اور

خواہشوں کو معقول حد تک پورا کرکے عزّت و وقار، صحت و عافیت، سکون اور آرام سے زندگی بسر کرسکے۔ اس نقطۂ نظر سے معاشیات میں دولت پر بحث کی جاتی ہے۔ دولت کو بڑھانے اور معاشی ترقی کے ذریعے سمجھائے جاتے ہیں۔ معاشیات لکھ پتی اور کروڑ پتی بننا نہیں سکھاتی بلکہ افراد اور گروہ کی معاشی خوشحالی کے لیے منصوبے بنانے میں مدد کرتی ہے۔

معاشیات میں بطورِ خاص چار موضوعوں پر سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے جن میں پیدائش دولت، صرف دولت، مبادلۂ دولت اور تقسیم دولت شامل ہیں۔ معاشیات میں جس طرح قدرتی ذریعوں اور وسیلوں سے فائدہ اٹھاکر دولت کی پیدائش میں اضافے پر توجّہ دی جاتی ہے اسی طرح دولت کے صحیح مصرف میں، دولت کے مبادلے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو اہمیت دی جاتی ہے تاکہ سماجی نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔

پیدائش دولت میں جس طرح اصل یا سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسانی محنت اہمیت رکھتی ہے۔ غرض انسانی جدوجہد معیارِ زندگی کا تعیّن کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ان خیالوں کے پیشِ نظر جب ہم اس تعریف پر نظر ڈالتے ہیں:

"Economics is the study of man's activities devoted to obtaining the material means for the Satisfaction of his wants."

یعنی "معاشیات میں انسان کی اس جدوجہد کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کے ذریعے مادی طریقوں سے انسان کی ضرورتوں کو تشفی پہنچائی جاتی ہے"۔

اس لحاظ سے معاشیات میں انسانی جدوجہد کا مطالعہ خالص معاشی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ معاشی مظاہر ہی سماجی قوتوں کا تعیّن کرتے ہیں۔ یہاں معاشیات اور سماجیات کا بہت قریبی تعلّق واضح ہوتا ہے۔ معاشی تنظیم کو بلند معیار پر پہنچانے یا برقرار رکھنے کے لیے معاشیات کی ماہرانہ واقفیت ناگزیر ہے، خاص کر زراعت، صنعت و حرفت، بیوپار، مالیات، بیمے، امدادِ باہمی کی انجمنوں کی خصوصی واقفیت رکھنے والے ہیں۔

معاشیات کے اکثر و بیشتر موضوع سماجیات میں اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر بے روزگاری کا مسئلہ ایک خالص معاشی مظہر ہے، لیکن اس کا سماجی پہلو بھی ہے۔ بہت سے سماجی طریق (Social processes) بے روزگاری میں اضافہ کا باعث ہوتے

ہیں۔معاشیات میں معاشی اسباب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر ہندوستان میں پانچ سالہ منصوبے کے ذریعے بے روزگاری کے مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن سماجیات کے ماہرین کی طرح معاشیات کے ماہرین بھی اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ افراد کے رُجحانوں میں تبدیلی لائے بغیر اس مسئلے کی یکسوی پوری طرح ممکن نہیں۔ بے روزگاری کا ایک سبب تو وہ رُجحان قرار دیا جاتا ہے جس کی بنا پر جسمانی محنت کو گری ہوئی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ملازمتوں کے قبول کرنے میں ۔ Value judgement کا اس قدر زبردست اثر رہتا ہے کہ لوگ جسمانی کام کے مقابلے میں بے روزگاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ اپنی ڈگری کی وقعت رکھنے کے لیے سرکاری ملازمتوں کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ظاہر ہے جتنی تعداد میں ہر سال طالبِ علم امتحان پاس کرتے ہیں اتنے ہی تناسب سے نہ تو جائیدادیں خالی ہوتی ہیں اور نہ جائیدادیں نکلتی ہیں۔ لہٰذا محدود جائیدادوں کے حصول کے لیے اکثریت جد و جہد کرتی ہے جس کا نتیجہ اکثر و بیشتر افراد کے لیے ذہنی اُلجھنوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان حالات میں بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کا احساس ضروری ہے۔ جسمانی محنت کی برتری اور پیشوں کی اہمیت کے شعور کا اجاگر ہونا ضروری ہے۔ تعطل اور جمود کو چھوڑ کر خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود اعتمادی کا پیدا ہونا لازمی ہے، ورنہ زندگی میں انحطاط پیدا ہو کر معیارِ زندگی کا پست سے پست تر ہونا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ معیارِ زندگی کی پستی سماجی بیماریوں کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

بے روزگاری کے علاوہ آبادی کا مسئلہ بھی سماجیات اور معاشیات کا اہم موضوع ہے۔ آبادی کے مسئلے کی وجہ سے کئی ذیلی مسئلے جیسے بے روزگاری، افلاس، گھروں کی قلت، بیماریاں، جہالت، فقیری، جُرم، کمتری کی بے راہ روی، جہالت اور عصمت فروشی جیسے انسانیت سوز امراض سماجی ڈھانچے کو گھن لگاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آبادی کی بڑھتی ہوئی شرح اور پیدائشِ دولت میں تناسب باقی نہیں رہتا۔ آبادی جس تناسب سے بڑھتی ہے اسی تناسب سے قدرتی اور انسانی وسائل ساتھ نہیں دیتے جس سے نپٹنے کے لیے آبادی کی تعداد پر معقول حد تک قابو پانا ضروری ہے۔ ہر حساس حکومت ترغیبی طریقوں کے ذریعے افرادِ خاندان کا تعین کرنے کے طریقے سمجھاتی ہے لیکن یہ طریقے اس حد تک موثر اور بامعنی ثابت نہیں ہو سکتے جب تک کہ لوگوں کے رُجحانوں اور خیالوں میں اس طرح تبدیلی نہ لائی جائے کہ وہ خود اس طریقے پر عمل

کرنے کی ضرورت محسوس کریں اس لیے کسی بھی معاشی پروگرام کی عمل آوری کے لیے سماج کے افراد کے ذہنوں سے تعصّب، وہم پرستی، تنگ نظری، شک وشبہات کا دُور ہونا ضروری ہے ورنہ یکے بعد دیگرے منصوبوں کے تیار کرنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیونکہ منصوبہ بندی بذاتِ خود خوشحالی کی ضامن نہیں تاوقتیکہ دوسرے سماجی عنصر بھی اس کا ساتھ نہ دیں۔

سیاسیات اور سماجیات؛ POLITICS AND SOCIOLOGY

سیاسیات اس اہم سماجی ادارہ کا علم ہے جسے حکومت کہا جاتا ہے۔ حکومت سماج کے اغراض و مقاصد کو عمل میں لانے کا ایک آلہ ہے جس کے لیے حکومت دستور یا *Constitution* بناتی ہے، جس کے ذریعے آئین وضوابط، فرائض اور حقوق کا تعیّن ہوتا ہے۔ اگر ہم پیدائش سے لے کر موت تک کسی فرد کی زندگی کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری سماجی زندگی کا کوئی ایسا دائرہ نہیں ہے جہاں حکومت کا دخل نہ ہو۔ مثال کے طور پر بچّہ کی پیدائش کے بعد اس کا نام بلدیہ میں رجسٹرڈ کروانا ضروری ہے جس کی بنا پر برتھ سرٹیفکیٹ (*birth certificate*) حاصل کیا جاتا ہے جو اسکول میں شرکت کے لیے ضروری ہے۔ ان تمام ملکوں میں جہاں جبری اور لازمی تعلیم کا نفاذ ہے ہر بچّے کو اسکول بھیجوانا ماں باپ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے ورنہ وہ قابلِ سزا ہیں۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے محکمۂ فراہمیٔ روزگار *Employment Exchange* میں نام کا درج ہونا ضروری ہے۔ شادی کے لیے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں طبی صداقت نامے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیرونی سفر کے لیے پاسپورٹ، گھر کی تعمیر کے لیے بلدیہ کی اجازت، گھر کی مُنتقلی یا فروخت کرنے کے لیے حکومت کی اجازت۔ ان تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ پیدائش سے لے کر موت تک حکومت کا دخل رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت کا کام صرف پولیس کے فرائض انجام دینا، تحدیدیں عاید کرنا، انفرادی اور خانگی معاملوں میں مداخلت کرنا ہے بلکہ ہر حکومت اپنے زیرِ تسلّط علاقے کی سازی آبادی کی ہر جہتی ترقی اور سدھار کی ذمّہ دار ہے۔ سیاسی آزادی کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو نشو ونما کا پورا پورا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنی رائے سے وہ مسلک اختیار کریں جو وہ اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان پر جبرًا ایسے قاعدے اور قانون عائد نہ کیے جائیں جن سے ان کے بُنیادی انسانی حقوق پائمال ہوتے ہیں۔ البتّہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اس آزادی کے استعمال میں دوسروں کی جائز آزادی کو تلف نہ کر دیں۔

چونکہ جمہوری حکومت کا کاروبار قوم کے تمام بالغ افراد کی رائے دہندگی پر منحصر ہوتا ہے اس حکومت کی مشینری کو حرکت دینے میں براہِ راست یا بالواسطہ سب ہی شامل ہوتے ہیں اور حکومت پر سے اعتماد اُٹھ جانے کی صورت میں انھیں اس بات کا اختیار رہتا ہے کہ وہ اپنی رائے دہی کے حق کو استعمال کرکے حکومت کا تختہ اُلٹ دیں، لیکن یہ سب ابھی وقت ممکن ہے جب کہ لوگوں میں سیاسی شعور صحت مندانہ طور پر جاگ اٹھے اور ان میں سیاسی اور سماجی معاملات کو ہر وقت جانچنے اور ان کے خلاف ہر وقت آواز بلند کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس کے لیے ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو انسان کی مخفی صلاحیتوں کو صحت مندانہ طور پر اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو جس کے ذریعے افراد اور اقتداری گروہ میں باہمی ربط اور میل جول، تبادلۂ خیال اور شرکتِ عمل قائم رہ سکے اور وہ تمام بندشیں ٹوٹ جائیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرتی ہیں اور ان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرکے سماجی ناانصافی اور عدم مساوات پیدا کرتی ہیں۔

جب حکومت ساری جنتا کی بھلائی قبول کرتی ہے تو ظاہر ہے حکومت کا رنگ خالص سیاسی نہیں رہتا بلکہ سماجی سیاست یا Social Politics کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ آج سیاست سے مراد صرف حکومت کے قاعدے، ضابطے، قانون اور پابندیاں نہیں ہیں بلکہ سماجی قانون سازی (Social legislation) کا مقصد ہر جہتی سُدھار اور نو تعمیر (Social Reconstruction) ہے۔ یہ سماجی قانون سازی ہی کا اثر ہے کہ غلامی کا انسدادی قانون، بچہ کشی کا ممانعتی قانون، بیگار کا ممانعتی قانون، ستی کا ممانعتی قانون، دو بیوی پن کا ممانعتی قانون، معدنی کارخانوں میں ماتین کا افادی قانون، ہفتہ واری چھٹی کا قانون، جبری تعلیم کا قانون، بچپن کی شادی کا ممانعتی قانون، شادی شدہ ہندو عورتوں کے علاحدہ رہنے اور نان نفقہ پانے کا قانون، چھوت چھات کا ممانعتی قانون، ہندو کوڈ بل وغیرہ ایسے بکثرت قانون نافذ ہوئے جن کی بدولت افراد کو انسانیت کے شایانِ شان زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکا۔

فہرستِ کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا۔

1. Rose, R.M. "Sociology—The Study of Human Relations." p 9.
2. Dressler, D. "Sociology—The Study of Human Interaction." p 4.
3. Khaleel Abbas Siddiqi, M: " Hindustan Ke Adi Basi." p265.
4. Damle, N.V.: "A cure for Cancer" Illustrated Weekly of India. Oct 16-24. 1977. p 33.
5. Coler Mentgemery: "School Sociology." p. 3-4.
6. Gilliu & Gilliu: " Cultural Sociology." p 22.
7. Rose: "Sociology." p.3.
8. Bajpai, S.R: "Methods in Social Survey & Research."
9. Goode & Halt: "Methods in Social Research."
10. Lerner, D: "The Human Meaning of the Social Sciences."
11. Martindale, D "The Nature & Types of Sociological Theory."
12. Ellwood, "Social Philosophy."
13. Bogrdus, "Development of Social Thought."
14. Inkeles, A: "What is Sociclogy."
15. Bierstedt, R: "The Social Order."
16. Sharmo, R.N.: "Introductory Sociology."

دوسرا باب

سماج کی ماہیت

NATURE OF SOCIETY

سماجیات کی سب سے بنیادی، مختصر اور جامع تعریف یہ ہے کہ وہ سماج کے سائنسی مطالعہ کا علم ہے۔ اس تعریف کے مطابق ہمارے ذہن میں سماج کا ایک واضح تصور ضروری ہے۔

انسان کو ایک سماجی ہستی یا "Social being" کہا جاتا ہے جس کا اظہار ایک ایسی تنظیم کی ساخت اور بازساخت (Construction and reconstruction) سے ہوتا رہتا ہے جو انسان کے افعال و اعمال پر قابو بھی رکھتی ہے اور ان کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ یہ تنظیم جسے سماج کا نام دیا جاتا ہے انسانی مشاغل پر تحدیدیں بھی عائد کرتی ہے۔ اس فعل اور عمل کی آزادی بھی دیتی ہے اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ اس کے لیے ایسے معیارات بھی قائم کرتی ہے جن کی پابندی ضروری ہوجاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں:

"Society is a system of usuages and procedures, of authority and mutual aid of many groupings & diersions of controls of human be havior and of liberties."

"سماج مروجہ طریقوں اور ضابطوں، اقتدار اور باہمی امداد، بکثرت گروہوں اور ان کی تقسیم کا نظام ہے جو انسانی افعال و اعمال پر تحدیدیں بھی عائد کرتا ہے اور آزادی بھی دیتا ہے۔"

فرد اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ہر نارمل فرد کو ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کے لیے سماجی بین عمل کے کسی نہ کسی سسٹم سے منسلک ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے مشترک مفادوں کی تکمیل سماج کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ سماج میں سماجی تعلّقات کا جال بچھا ہوتا ہے۔ ان تعلّقات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے چند طبعی اور سماجی امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹائپ رائٹر اور میز، زمین اور سورج، دھویں اور آگ کے باہمی تعلّق پر غور کیجیے اور ساتھ ہی والدین اور بچّوں، میاں اور بیوی، اُستاد اور شاگرد، آجر اور مزدور، مالک اور نوکر، ڈاکٹر اور مریض کے آپسی تعلّقات کو بھی مدِنظر رکھیے۔ یہ دونوں مختلف نوعیت کی مثالیں ہیں یہ ضرور ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے وجود کا محتاج ہے، لیکن ان کے باہمی تعلّقات کی نوعیت بالکل جُداگانہ ہے۔ ٹائپ رائٹر اور میز، زمین اور سورج، دھویں اور آگ میں قریبی تعلّق ہونے کے باوجود تعلّقات کی نوعیت کسی طرح بھی سماجی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ ان میں ذہنی اور نفسی کیفیتوں کا کوئی دخل نہیں جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے وجود سے آگاہ نہیں۔ چونکہ ان میں باہمی یگانگت کا شعور نہیں ہوتا اس لیے ان میں کوئی تعلّق ممکن نہیں۔

سماج کا وجود اس وقت عمل میں آتا ہے جب کہ ربط پیدا ہونے کے بعد ایک ہستی کو دوسری ہستی کے وجود کا احساس ہو۔ جب اس احساس کے ساتھ افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو ان میں سماجی تعلّقات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سماجی تعلّقات مختلف النوع ہوتے ہیں۔ ان تعلّقات میں اتنی وسعت پائی جاتی ہے کہ ان کی حدبندی ضروری ہو جاتی ہے تاکہ ان کو نوعیت واضح ہو سکے۔ اس لیے ان کی تقسیم خاندانی، معاشی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی، تفریحی، دوستانہ، مخالفانہ، شخصی، غیر شخصی، ابتدائی، ثانوی، براہِ راست اور بالواسطہ دائروں میں کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سماجی تعلّقات کی دو واضح شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں: ایک مثبت اور دوسری منفی۔ سماجیات کے ماہرین ان دونوں شکلوں کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ ہر سماجی تعلّق باہمی آگاہی (Mutual recognition) پر مبنی ہوتا ہے اور ہر تعلّق میں مشترک احساس پنہاں رہتا ہے۔

اس ضمن میں ایک ہلکا سا اشارہ کافی ہے کہ سماج کا وجود صرف بنی نوعِ انسان تک محدود نہیں ہے بلکہ حشرات الارض اور حیوانوں میں بھی مختلف نوعیت کی سماجی تنظیمیں پائی جاتی ہیں جس کی نمایاں مثال چونٹیاں اور شہد کی مکھیاں ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ زندگی کے نچلے

درجے (lowest stage of life) پر زندگی گزارنے والی ذی حیات ہستیوں میں سماجی آگاہی کا شعور بہت مدھم ہوتا ہے اور سماجی ربط (Social Contact) کی نوعیت بالکل ابتدائی ہوتی ہے اور بہت کم عرصے تک برقرار رہتی ہے۔ اس کے برخلاف اونچے درجے کے میدانوں میں سماج کی تشکیل ان کی ضرورتوں کی نوعیت کے مطابق اور ان کی نسل کی بقا کا لحاظ کرتے ہوئے عمل میں آتی ہے۔

چونکہ اس وقت ہماری بحث کا مرکز انسانی سماج ہے، اس لیے حیوانی سماج سے گریز کرتے ہوئے انسانی سماج سے متعلق ہم اس اہم نکتے پر غور کرتے ہیں کہ سماج میں یکسانیت اور تفریق (Likeness and differences) کے عنصر بہت زیادہ نمایاں رہتے ہیں یکسانیت اور احساس یکسانیت پر سماج کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لیسے ہی افراد سماج کے رُکن بن سکتے ہیں جن میں خیالوں، جذبوں، مسلکوں، عقیدوں اور تمدّنی نمونوں میں کچھ نہ کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ ان مشابہتوں کی وجہ سے باہمی تعلّقات دیرپا اور وسیع تر ہوتے ہیں جن کی بنا پر افراد میں ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کی محبّت سے لُطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس اہم سماجیاتی نکتے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سماجیات کے مشہور پروفیسر ایف۔ ایچ۔ گڈنگس (F.H. Giddings) نے ہم جنسی شعور (Consciousness of Kind) کو سماج کی بُنیاد قرار دیا ہے۔ ہم جنسی شعور جن یگانگتی احساسوں پر مبنی ہوتا ہے ان میں نسلی یگانگت، زبان اور ادب کی یگانگت، مذہبی یگانگت، معاشی یگانگت، سیاسی یگانگت، مفادوں کی یگانگت اور تمدّنی قدروں کی یگانگت شامل ہیں۔

مختلف سماجوں میں یگانگت کا تصوّر مختلف ہوتا ہے۔ آدی باسی سماجوں میں اس احساس کا مرکز حقیقی یا فرضی خونی تعلّقات ہوتے ہیں، لیکن شہری سماجوں میں یگانگت کے مفہوم کو بہت زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لوگ نہ صرف قومی مفاد کے لیے کوشاں رہتے ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ ساری نسلوں کو "One World" اصول کے تحت ایک ہی سماج کا رُکن قرار دینا چاہیے۔

سماج میں تفریق یا differences کا عنصر بھی بہت زیادہ نمایاں رہتا ہے جس کی وجہ سے سماجی تعلّقات میں تنوع ممکن ہے ورنہ سماجی تعلّقات کا دائرہ اتنا تنگ ہو جائے گا کہ پھر انسانی اور حیوانی سماج میں امتیاز باقی نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں نہ تو

ادل بدل یا give and take کا خیال پیدا ہوسکتا ہے اور نہ باہمی تعلقات پر مبنی سہولتیں حاصل ہوسکتی ہیں ۔یہاں پر ہمارا مطلب کسی سماج کے مکمّل یا غیر مکمّل ہونے یا انصاف اور ناانصافی پر مبنی ہونے سے نہیں ہے بلکہ سماجی تعلقات کی مختلف نوعیتوں میں تفریق یا differences کے جوابی رول یعنے reciprocal role کی وضاحت کرنا ہے۔

تفریق کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں ۔مثال کے طور پر خاندان کی بنیاد ہی جنسی فرق پر مبنی ہے ۔اس اساسی فرق کے علاوہ میاں بیوی میں صلاحیتوں، دلچسپیوں اور رُجحانوں کے لحاظ سے کافی فرق پایا جاتا ہے۔

جس تناسب سے پیشہ وارانہ اور نئی زندگی میں مہارت اور فوق مہارت (Super Sepecialisation) پائی جاتی ہے اسی تناسب سے صلاحیتوں کا فرق واقع ہوتا ہے صلاحیتوں کا یہی فرق سماجی تقسیم کار یا "Social division of labour" کا باعث بنتا ہے ۔سماج میں تقسیم کار تعاوُن کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے جو یکساں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے غیر یکساں افعال کو انجام دیتے ہیں نمودار ہوتا ہے ۔مثال کے طور پر منافع حاصل کرنے کی یکساں خواہش ، افراد کو کسی مخصوص کاروبار کی طرف راغب کرتی ہے ۔اسی طرح کا جذبہ خاندان کی تشکیل میں پنہاں رہتا ہے جس کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے، ایک دوسرے کے خیالوں کو سمجھ کر اس کا احترام کرنے، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے ۔غرض ضرورتوں کی یکسانیت سے سماجی تنظیم میں فرق پیدا ہوتا ہے ۔اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ سماج میں وسعت بنیادی یکسانیت (Primary likeness) اور ثانوی تفریق (Secondary differences) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس ضمن میں انسانی فطرت کی اس اہم خصوصیت کی طرف اشارہ ضروری ہے جس کا اظہار آج سے برس ہا برس پہلے سیاسیات کے شہرۂ آفاق یونانی مفکّر، ارسطو نے اس لافانی جملے میں کیا تھا کہ انسان "سماجی حیوان" ہے جس کی شہادت مختلف مدارج کی سماجی تنظیمیں دیتی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے روئے زمین کے ہر خطّے میں پائی جاتی ہیں ۔غرض یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان تنہا بطور فردِ واحد کے زندگی نہیں بسر کر سکتا بلکہ دوسرے افراد کے ساتھ مل جُل کر ہی بنیادی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے ۔یہ ضرور ہے کہ انسان اپنے خیالات،

جذبات اور عقائد کی دُنیا میں ضرور رہنا ہے جہاں کسی دوسرے کا گزر نہیں، لیکن تنہائی کے ان گھنٹوں میں بھی درحقیقت انسان تنہا نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی نفسی اور ذہنی کیفیتیں اپنی تشکیل کے دوران میں دوسرے افراد کے خیالوں، جذبوں اور سماجی تعلقات کی نوعیت سے متاثر ہو چکی ہیں۔ اس لحاظ سے انسانی تخیّل اور ذہن دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ان تجربوں اور احساسوں سے تشکیل پا چکے ہیں جو کسی خاص سماج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ دراصل انسان کے سماجی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مفکّرین اس خیال سے اختلاف کرتے ہیں کہ انسان فطرتاً سماجی نہیں ہے اور نہ دوسرے افراد کے ساتھ مل جُل کر زندگی گزارنا اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں انسان بھی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ تجربوں کی مدد سے اسے اندازہ ہوا کہ یہ حالت مضرت رساں ہے جس کی بنا پر کئی سماجی ادارے رفتہ رفتہ تشکیل پاتے گئے۔ اس نکتے کو سماجیات کو مشہور مفکّر ایل۔ ایف۔ وارڈ (L.F. Ward) نے اپنی کتاب "Dynamic Sociology" میں اس طرح پیش کیا ہے:

"Man was not originally social by nature, and society did not exist at the Beginning of human society history. But it has arisen through the efforts of men to preserue. them Selves, to protect them-Selves."

یعنی "انسان فطرتاً سماجی نہیں ہے اور انسانی تاریخ کی ابتدا میں سماج کا وجود نہیں تھا۔ لیکن انسان نے اپنی بقا اور حفاظت کے لیے جدوجہد کے ذریعے سماج کی بُنیاد ڈالی"۔

اس لحاظ سے وارڈ کے نزدیک سماج کی بُنیاد اس سعی کا نتیجہ ہے جو اس نے اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھی۔

اس خیال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماج کی تخلیق اس کی افادیت میں مضمر ہے۔ اگر ان فائدوں کا حاصل کرنا انسان کے لیے ضروری نہ رہے تو پھر سماج کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال انسان فطری طور پر سماجی واقع ہُوا ہے یا نہیں ایک نزاعی بحث ہے، مگر وہ مل جُل کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ایک مسلمہ امر ہے۔ زندگی کے تحفّظ، آرام اور آسائش، ضرورتوں کی تکمیل، تعلیم و

تربیت اور موقعوں کی فراہمی کے لیے سماج کا وجود ناگزیر ہے جو انسان کی مطلق ضرورت یا absolute need ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کا چاہے کوئی پہلو ہو، خاندانی، مذہبی، معاشی، تعلیمی، تفریحی اور سیاسی سماج کے بغیر ان سب کا وجود ایک خیالِ خام ہے۔

غرض انسان کی پیدائش اور بقار سماج کے وجود پر مبنی ہے، اس لیے یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں کہ انسان کے لیے سب سے تکلیف دہ اور روح فرسا سزا قیدِ تنہائی ہے۔ چاہے ہم آزادی اور غیر محتاجی کا دعویٰ کتنی ہی شدت سے کیوں نہ کریں دل ہی دل میں اس کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ سماج کے بغیر زندگی ممکن نہیں، البتہ ایسے گنے چنے لوگوں کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں جنھوں نے ترکِ دُنیا کا خیال کرکے کسی فوق فطری قوت یا مظہر سے اپنا رشتہ جوڑا، لیکن ان کا شمار نارمل انسانوں میں نہیں ہوتا، بلکہ فوق البشر Super - human میں کیا جاتا ہے اور ان سے بالکل نیچی سطح کے افراد کا شمار تحت البشر sub -human میں ہوتا ہے۔

غرض سماج ان تمام افراد پر مُشتمل ہوتا ہے جو ایک مخصوص تمدّن کو اپناتے ہیں اور آپس میں اپنے کو ایک دوسرے سے متحد سمجھتے ہیں۔

> "A society consists of all the people who share a distinct & centinving way of libe (that is, a culture) and think of them Selves as one united people."

یعنی سُماج مشتمل ہوتا ہے ان تمام لوگوں پر جو ایک مخصوص اور چلتی رہنے والی زندگی (یعنی تمدّن) کے حصّہ دار ہوتے ہیں اور اپنے کو دوسرے سے متحد سمجھتے ہیں۔"

سماج میں ایک چھوٹا علاقہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک شہری بھی۔ ایک خطّہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک قوم بھی۔ اس لحاظ سے سماج کے لیے چھوٹے یا بڑے علاقے کی شرط نہیں ہے بلکہ سماج کے تمام ارکان کا ایک مشترک تمدّن سے تعلّق ہونا اور تمام افراد کا ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی بنیادی اور ثانوی ضرورتوں کی تکمیل خاطر خواہ طور پر ہو سکے۔ انسان کی اہم خواہشوں میں بقائے حیات اور اپنی نسل کو برقرار رکھنے کی فطری اُمنگ ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں تمدّن کی وضاحت

ضروری ہے:

"Frome the sociological point of view, culture Consists of the sum total of skills, beliefs, knowledge & products that are commonly shared by a number of people & transmitted to their children."

یعنی "سماجیاتی نقطۂ نظر سے، تمدّن مشتمل ہوتا ہے ہنروں، عقیدوں، معلومات اور حاصلات کے مجموعہ پر جس کے مشترک طور پر تمام افراد حصّہ دار ہوتے ہیں اور جو اپنے بچّوں میں اسے منتقل کرتے ہیں"۔

تمدّن ایک سماجی ورثہ ہوتا ہے جس کے تمام افراد حصّہ دار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر زبان جس کا سیکھنا انسانی ربط کے بغیر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لحاظ سے سماج تمدّن کی افزائش کا مرکز ہے۔ سماج کا رکن بن کر ہی ہم زندگی گزارنے کا طریقے سیکھتے ہیں۔

اس بحث سے ہمارے ذہن میں سماج کے تصوّر کے بارے میں چند واضح نکتے اُبھرتے ہیں۔

1 : عام طور پر افراد کے مجموعے کو سماج کہا جاتا ہے، لیکن محض سماج کے ہر فرد کا یا تمام افراد کا مجموعی طور سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے ہمارے سامنے سماج کی مکمّل اور صحیح تصویر سامنے نہیں آتی، کیونکہ سماج محض افراد پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس کی ساخت اور فعل اسے دوام بخشتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر افراد پیدا ہوتے، مرتے اور ان کی جگہ دوسرے افراد لیتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں تسلسل برقرار رہتا ہے۔

2 : سماج کی بقا کے لیے چند فعالی ضرورتوں (functional needs) کا پورا ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی سماجی نظام کا برقرار رہنا بھی اہم ہے۔ یہ سماجی نظام رسم و رواج، روایتوں، افعالی نمونوں کے علاوہ اقتداری نظام، قانون اور ضابطوں کی وجہ سے برقرار رہتا ہے۔

3 : سماج کی بقا کے لیے نئے افراد کی بھرتی ضروری ہے تاکہ طبعی عمر کو پہنچنے ناگہانی حادثوں کا شکار ہونے کی وجہ سے جو افراد موت کی نذر ہو جاتے ہیں ان کی جگہ نئے افراد لے سکیں۔ اس لیے پیدائش اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے خاندان اور شادی کا ادارہ افراد کو ایسے معاہدوں،

ضابطوں اور توقعات میں جکڑ دیتاہے کہ وہ اپنے جنسی جذبے کی تسکین کے لیے سماج کے مروّجہ اور تعلیم شدہ معیاروں کی پابندی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

4 : بچوں کو متعلقہ سماج کے تمدنی نمونوں سے واقف کروایا جاتا ہے۔ بچوں سے وابستہ چاہے ماں باپ ہوں یا دوسرے افراد انھیں سماج کے پسندیدہ افعالی نمونوں سے واقف کراتے ہیں تاکہ آئندہ چل کر مطابقت کا طریق ان پر گراں نہ گزرے۔

5 : ہر سماج میں چند ایسے رسوم و رواج کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جس کے ذریعے نئی نسل میں بہادری، ایمانداری اور قیادت کے جذبات ابھرتے ہیں، اس لیے وقتاً فوقتاً ایسے تہوار اور جشن منائے جاتے ہیں جن میں گذشتہ واقعات کو یاد دلاکر حب الوطنی اور عقیدت کے جذبوں کو ابھارا جاتا ہے۔ گذشتہ نسلوں کی قربانیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی قیادت اور رہنمائی میں حاصل کی ہوئی کامیابیوں پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ان کی بے لوث خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے تاکہ نئی پود میں ملک کے لیے قربانی کرنے کا جذبہ ابھرتا جائے "یوم شہیدان" اور "جشن آزادی" اسی سلسلے کی مثالیں ہیں۔

6 : ہر سماج اساسی اور خُلقی قدروں پر زور دیتا ہے جسے اکثریت کی تائید حاصل رہتی ہے۔ افراد کے لیے ان قدروں کی پابندی ضروری ہو جاتی ہے۔

7 : کسی بھی سماج کا تمدن بڑی حد تک افراد کے رجحانوں اور اقدار (values) کے ذریعے تشکیل پاتاہے۔ قدر اور رجحان کی سماجیاتی تشریح اس طرح کی جاتی ہے:

"A value is an individual's socially acquired judgement of the degree to which a particular stimulus is desirable or undesirable."

یعنی قدر ان اکتساب شدہ سماجی فیصلوں پر مبنی ہوتی ہے جس کی بناء پر کوئی فرد ایک مخصوص ہیج کو خوش آئند یا غیر خوش آئند سمجھتا ہے۔

اور

"An attitude is an individual's learned inclination to respond to a specific stimulus

in a particular way.

یعنی "رُجحان فرد کا وہ اکتسابی میلان ہوتا ہے جو ایک مخصوص ہیج کے جواب میں ایک مخصوص طریقے سے ظاہر ہوتا ہے"۔

غرض سماج سماجی تعلّقات کا ایک سسٹم ہوتا ہے جس میں سماج کے مروّجہ طریقوں کے مطابق سماجی بین عمل جاری رہتا ہے جس سے گروہی یکجہتی پیدا ہوتی ہے۔

انسانی اور حیوانی سماج: HUMAN & ANIMAL SOCIETY

سماج اور سماجی زندگی کا تعلق نہ صرف انسانوں تک محدود ہے بلکہ چونٹیاں، دیمک، پرندے اور دوسرے کئی جاندار بھی سماج میں زندگی گزارتے ہیں، لیکن ہر سماج کی نوعیت الگ ہوتی ہے ان میں کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں اور کچھ غیر مشابہتیں بھی۔

ہر سماج کی تشکیل کے لیے چند بنیادی شرطیں ضروری ہیں جن میں سے ایک اہم شرط ربط کی سطح یعنی "level of association" ہے، جس کے لیے اس امر پر غور کرنا پڑتا ہے کہ کیا چند افراد یا جانوروں کے کسی جگہ پر اکٹھا ہو جانے سے سماج کی تشکیل عمل میں آجاتی ہے؟ اس سلسلے میں اجتماع یا Aggregation کی اصطلاح پر توجہ دینی پڑتی ہے۔ سماجیات میں اجتماع کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ یکساں خارجی حالات میں جب کہ انتہائی مجبوری کی صورت ہو جاندار ہستیوں کا کسی مقام پر جمع ہو جانا مثلاً سیلاب کی وجہ سے اتفاقیہ طور پر کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کا ایک دوسرے کے قریب آجانا۔ اسی طرح تپش، رطوبت، روشنی اور دوسرے خارجی محرکات کی وجہ سے کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کا کسی مقام پر اجتماع نظر آتا ہے، لیکن اس طرح کے اجتماع سے سائنسی مفہوم واضح نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی اہمیت گرد و غبار کے طوفان سے زیادہ نہیں ہوتی کہ زوروں سے اٹھا اور ختم ہو گیا۔

جس طرح محض اکٹھا ہو جانے یا اجتماع کو سماج کی تشکیل کا ذمّہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا اسی طرح اشتہا یا بھوک کی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے کسی تالاب کے کنارے چرند اور پرند کا جمع ہو جانا یا شکار کی غرض سے جانوروں کا موقع کی تاک میں اِدھر اُدھر پھرتے رہنا سماجی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا یعنی دوسرے لفظوں میں جب تک افراد یا دوسرے جاندار کسی مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے باہمی جد و جہد نہیں کرتے اس وقت تک سماجی تعلّقات قائم نہیں ہو سکتے۔

اس امر کی مزید توضیح کے لیے ڈکوری یا دوسرے کیڑوں کی زندگی پر غور کرنا ہوگا جو سماجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ڈکوری کا پہلا روپ Wasp Larve ہے جس کے جسم سے ایک رقیق میٹھا سیال خارج ہوتا ہے جو کارندہ ڈکوریوں (worker wasp) کی غذا کے کام آتا ہے۔ اس باہمی جد وجہد کو trophallaxes کہا جاتا ہے جس کی بنا پر سماجی تعلّقات قائم ہوتے ہیں۔ تقسیم کار کا اصول چیونٹیوں کی زندگی میں بھی بہت زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمّے مخصوص کام ہوتے ہیں۔ چند اناج اکٹھا کرتے ہیں، اور چند انڈے دیتے ہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ سماجی تعلّقات کے لیے باہمی ہیج اور جوابی فعل کی بندشیں ضروری ہیں۔ باہمی ہیج اور جوابی فعل (mutual stimulus & response) کی وجہ سے باہمی آگاہی "mutual awareness" پیدا ہوتی ہے۔ باہمی آگاہی کی وجہ سے سماجی تعلّقات قائم ہوتے ہیں اور جب سماجی تعلّقات کا منظّم نظام عمل میں آتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں سماج کہلاتا ہے۔

چونکہ سماج ایسے عضویوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سماج کی مختلف نوعیتوں کو سمجھنے کے لیے عضویوں کی ہیئت پر غور کیا جائے۔

عضویوں کا ایک پیچیدہ نظام ہوتا ہے جن کا فعل خلیوں (cells) کے باہمی تعلّقات پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ عضویوں کا وجود انفرادی خلیوں کے اشتراک پر منحصر ہے لیکن پھر بھی خلیوں کو دیکھ کر عضویے کی ساخت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عضویے کی حیات کے دوران خلیے کئی بار ٹوٹتے اور ازسرِ نو بنتے ہیں مگر ان سے عضویوں کی عام شکل و صورت میں کوئی قابلِ لحاظ فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بالعموم کسی بھی عضویہ کا دورِ حیات مختلف ادوار پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً بالیدگی، پختگی، انحطاط اور موت۔ زندہ عضویوں کی دو اہم بُنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تغذیہ جس سے عضویے کو زندہ رہنے کے لیے توانائی ملتی ہے اور دوسرے تحفّظ۔ قدرت کا مقصد انفرادی طور پر کسی مخصوص عضویہ کو دوام بخشنا نہیں ہے، کیونکہ عضویہ دیر سویر فنا پذیر ہے لیکن نوع کی بقاء کا تحفّظ ضروری ہے۔ اس طرح عضویہ کو ایک اور بُنیادی ضرورت کی تکمیل کرنی پڑتی ہے اور وہ ہے تولید۔ جب تولید کا فعل مکمل ہو جاتا ہے تو پھر عضویہ میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے جو بتدریج اس کی موت پر ختم ہوتا ہے۔

اس طرح اگر کسی عضویے کی دورِ حیات کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی غذا کا ایک قابل لحاظ حصّہ تولید کے کام آتا ہے۔ اس طرح تولید اور تغذیہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جب تولید کا عمل مکمّل ہو جاتا ہے تو ہر نوع اپنی نئی نوع کی جان سے زیادہ حفاظت کرتی ہے۔ نیز تغذیہ، تولید اور تحفّظ ایک ہی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جو کسی بھی نوع کی بقاء میں اہم رول انجام دیتی ہیں۔

جس طرح کسی عضویے کی ساختی اکائیاں ایک دوسرے سے باہمی ربط اور تعاون کرتی ہیں اسی طرح کا ربط اور نظم سماج میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ ربط عضویوں کی ساختی اکائیوں یعنی خلیوں کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ ہم جنس عضویوں میں پایا جاتا ہے۔ عضویوں کی طرح سماج کی بھی ایک مخصوص ساخت ہوتی ہے اور اس ساخت کو تشکیل دینے والے اجزاء انفرادی اور اجتماعی طور پر سماج کی مکمّل بقاء کے لیے کوشش کرتے ہیں اور فرد کے قطع نظر سماج کو تسلسل اور دوام بخشتے ہیں۔ سماج کی ساخت اور تسلسل کی وجہ سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ سماج کے مطالعہ کو محض افراد تک محدود نہ کر دیا جائے، کیونکہ افراد پیدا ہوتے اور مرتے ہیں بلکہ اس تسلسل پر غور کیا جائے جس کی وجہ سے برس ہا برس سے مختلف سماج چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا سماج کی مثال ایک گھر کی طرح ہے جس کی تعمیر میں اینٹ، پتھر، چونا، سیمنٹ، لکڑی غرض متعدد اشیاء استعمال ہوتی ہیں لیکن گھر مکمل ہونے کے بعد یہ تمام اشیاء اپنی انفرادیت کھو کر ایک بڑی اکائی میں ضم ہو جاتی ہیں جس کا ماحصل ایک مکمّل گھر، رہائش کے قابل سامنے آتا ہے۔

سماج میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ماحول سے مطابقت کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ سماج سے وابستہ افراد کو نہ صرف غذا، تحفّظ اور تولید کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں بلکہ عددی برتری، تقسیم کار اور مہارت کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں جس سے پوری نوع کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض دفعہ سماج کی بھلائی اور اپنی نوع کی بقاء کے لیے بڑی زبردست قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ ماحول سے مطابقت کی وجہ سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون سی نوع اپنی ارتقائی تاریخ (evolutionary history) میں کتنی بار اور کتنی کثرت سے نمودار ہوئی۔ مثال کے طور پر مارٹن وہیلر (Monten Wheeler) نے تحقیق سے اس بات کا پتہ چلایا ہے کہ چیونٹیوں کی ایک مخصوص نوع جو سماجی زندگی گزارتی تھی تقریباً تیس دفعہ نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی۔

ارتقائی تاریخ میں کسی سماج کے مکرر نمودار ہونے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان میں سماجی زندگی سے مطابقت کرنے کا مادہ ہے۔ انسانی نوع یعنی ہوموساپین (HomoSapiens) نے بھی مطابقت کرنے کا طریق اپنے حیوانی اجداد (animal ancestor) سے سیکھا ہے۔ جس کی وجہ سے حیاتیاتی ضرورتیں (biological needs) آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔

سماج کا ظہور ارتقاء کی طرف ایک بہت بڑا قدم ہے۔ بعض انواع نے اس سمت میں آگے کی طرف قدم بڑھایا اور بعض پیچھے رہ گئے۔ زندہ عضویوں کی تاریخِ حیات میں بہت سے جوری (crucial) دور آئے مثلاً خلیوں کا نمودار ہونا اور پھران کا کثیر خلوی (multi cellu-lar) حالت اختیار کرنا، اس کے بعد فقروی نظام (vertebrate System) کا ظہور۔ دوسرے اقدامات کی طرح یہ بھی پُرانے اجزاء کی تبدیلی اور ترمیم سے ایک تعمیرِ نو ہے جس میں بالکلیہ نئی خصوصیتیں پیدا ہو گئیں جو اتفاقی ارتقاء (emergent evolution) کی موزوں مثال ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام زندہ ہستیاں وقتیہ اور عارضی طور پر بھوک اور خطرے کے وقت ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں لیکن سماج کی تشکیل کے لیے صرف اجتماع کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سماجی بین عمل کا ایک منظم نظام ہونا چاہیے۔ اس توضیح سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سماج چاہے وہ انسانی ہو یا حیوانی اس کے لیے چند بنیادی شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے جن میں سے یہ چار اہم ہیں۔

1: آبادی کا قائم رہنا

(الف) غذا کا مناسب انتظام

(ب) خطروں سے حفاظت

(پ) نئے عضویوں کی تولید

2: تقسیم کار

3: گروہی یکجہتی

(الف) اراکین کے مابین ربط پیدا کرنے کے محرکات

(ب) باہمی رواداری اور مدافعات کے محرکات

4: سماجی سسٹم کا استمرار (جاری رہنا)

ظاہر ہے کسی بھی سماج کا وجود افراد کی معقول تعداد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا چاہے اس کا تعلق حشرات الارض سے ہو، انسان یا حیوان سے۔ آبادی کی بقا کا دار و مدار مناسب اور معقول غذا پر ہے اور غذا اسی وقت فراہم ہو سکتی ہے جب کہ قدرتی ذریعوں سے بخوبی واقفیت ہو اور ان قدرتی ذریعوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت موجود ہو۔ غذا فراہم ہونے کے بعد ہر ایک تک اس کی رسد ضروری ہے۔

ہر جاندار اپنی متعلقہ نوع کی حفاظت کے لیے ممکنہ کوشش کرتی ہے اور انھیں ہر طرح کے خطروں سے بچانے کی احتیاطی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ چاہے یہ خطرات داخلی ہوں یا خارجی۔ مختصر یہ کہ اپنی اولاد کو قدرتی حادثوں، بیماریوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی فطری خواہش ہر جاندار میں پائی جاتی ہے۔

چونکہ ہر سماج میں پرانے رُکن یا تو اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر موت کی نذر ہو جاتے ہیں یا ناگہانی حادثوں کی بنا پر، اس لیے ان ارکان کی جگہ لینے کے لیے قدرت نے تولید کا انتظام رکھا ہے تاکہ ایک طرف جنسی جذبے کی تکمیل ہو جائے تو دوسری طرف ہونے ارکان وجود میں آتے ہیں ان کی معقول دیکھ بھال کی جائے۔

غرض یہ وہ حیاتیاتی ضرورتیں ہیں جن کی تکمیل ہر ہستی انفرادی طور پر کرتی رہتی ہے لیکن سماجی نظام میں ان ضرورتوں کی تکمیل کسی نہ کسی قسم کے گروہی باہمی عمل (group interaction) کے ذریعے عمل میں آتی ہے، اس لیے انسانی سماج میں تعاون اور تقسیم کار کے ذریعے بنیادی ضروتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں مہارت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔

اس کے علاوہ افراد کے مابین ربط کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہونا چاہیے جس کے لیے محرک ضروری ہے جب افراد کے مابین ربط قائم ہوتا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتنی پڑتی ہے جس کی بنا پر مختلف سماجوں کے ارکان میں فرق کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہر سماجی نظام کی برقراری کے لیے کچھ نہ کچھ میکانزم ضروری ہے تاکہ سماجی تعلقات کا نظام صرف مخصوص افراد کے دورِ حیات یا ان کی کسی ایک پیڑی تک محدود نہ ہو جائے بلکہ وہ جاری رہے۔

حیاتی۔سماجی نظام: BIO-SOCIAL SYSTEM

مختلف سماجوں کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سماجی نظام کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں اسی فرق کو مدِنظر رکھتے ہوئے سماجوں کی درجہ بندی ممکن ہے۔ اس قسم کی درجہ بندی ابتدا میں توارث کی بنا پر کی گئی اور اس کے بعد تمدّن کی اساس پر۔

ایسے تمام سماج جن کی تخصیص وراثتی خصوصیتوں کی بنا پر ممکن ہے حیاتی۔سماجی نظام کہلاتے ہیں۔ اس کے برعکس صورت سماج۔تمدّنی (Socio — cultural) نظام کی ہوگی۔ حیاتی۔سماجی نظام کی تقسیم انواع کے فرق کو مدِنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے اور سماج تمدّنی نظام کی تقسیم تمدّنی نمونوں کی بنا پر۔

حیوانی دُنیا میں حیاتی۔سماجی نظام کی تشکیل توارث کے زیرِ اثر عمل میں آتی ہے۔ ہر ایک دوسرے سے ان ہی حدود کے اندر عمل کرتا ہے جو اسے اپنے بُزرگوں سے حاصل ہوتے ہیں ہیج اس کے جوابی فعل (Stimulus & response) سے جو نتائج رُونما ہوتے ہیں اُن کے مجموعی حاصلات سے یہ نظام ترتیب پاتا ہے۔ غرض افعال کا تعیّن بھی جسمانی خصوصیتوں کی بنا پر ہوتا ہے اور اس طرح فعلیاتی تخصیص سے تقسیم کار عمل میں آتا ہے۔ ایسے سماجوں کی بقا کا دارو مدار جینز (genes) کی منتقلی پر ہوتا ہے۔ چونکہ ان سماجوں کا ڈھانچہ حیاتیاتی اصولوں پر کھڑا ہوتا ہے اس لیے ان سماجوں پر حیاتیاتی۔سماج کی اصطلاح لاگو کی جاتی ہے۔

اگرچہ حیاتی۔سماجی نظام سے تعلق رکھنے والی انواع کا عمل بڑی حد تک یکساں ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان میں تخصیص ممکن ہے۔ انسانی سماجوں میں اس قسم کی یکسانیت نہیں ملتی تمام بنی نوعِ انسان کا تعلق ہوموسا پئین سے ہونے کے باوجود سماجی زندگی میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق تمدّنی ورثے کی منتقلی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

ممیلین سماج: MAMMALIAN SOCIETY

توارث کا اثر یوں تو ممیلین سماجوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ان سماجوں میں تمدّن کا اثر بہت زیادہ غالب رہتا ہے۔

تمام ممیلین سماجی گروہوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اقلِ ترین جسمانی

فرق پایا جاتا ہے مثال کے طور پر ایک بیل اور گائے، بلی اور بلے، بندر اور بندریا میں جسمانی قدو قامت اور حجم کی بنا پر اتنا زیادہ فرق نہیں ہوتا جتنا کہ چیونٹیوں اور دوسرے حشرات الارض میں ہوتا ہے۔ رانی چیونٹی اور کارندہ چیونٹی میں وضع قطع کے اعتبار سے جو فرق نظر آتا ہے اس سے گمان گزرتا ہے کہ کہیں ان کا تعلق دوسری نوع سے تو نہیں ہے لیکن اس قسم کا واضح فرق ممیلین نوع میں نہیں پایا جاتا اس لیے بعض وقت نر اور مادہ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ممیلین سماج میں ساختی تخصیص (Structural Specialisation) کے فقدان کی وجہ سے مادہ جنس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں بچے پیدا کرنے والے الگ اور کام کرنے والے الگ نہیں ہوتے جیسا کہ چیونٹیوں میں ہوتا ہے۔ ممیلین سماج میں ہر مادہ بچے بھی پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی دوسرے فرائض کی انجام دہی بھی۔

ممیلین سماج میں جنسی اختلاط وقفے وقفے سے ایک طویل عرصے تک جاری رہتا ہے جب کہ رانی چیونٹی ایک دفعہ کے جنسی اختلاط سے Sperm کا اتنا زیادہ مادہ اپنے جسم میں محفوظ کر لیتی ہے کہ وہ زندگی بھر انڈے دیتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممیلین کے مقابلے کیڑے مکوڑے اور دوسرے حشرات الارض ہزارہا تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔

ممیلین سماج کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سماجی افعال کو سیکھنے کی صلاحیت ہوتی جو وہ ایک سماجی گروہ کے رکن کی حیثیت سے سیکھتے ہیں۔ سماجیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس قسم کا اکتساب 'تمدنی' اس لیے نہیں کہلایا جا سکتا کیونکہ ان میں علامتی ترسیل یا Symbolic communication کا فقدان ہوتا ہے۔ لہٰذا انھیں براہ راست ذاتی تجربوں سے سیکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بندر اپنے بچے کو چلنا، چڑھنا، کھینا اور بھاگنا سکھلائے گا مگر وہ اپنی زندگی کے تجربوں کی تصویر اپنے بچوں کے سامنے نہیں کھینچ سکتا۔ اس لحاظ سے جانوروں میں اکتساب کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ نہ تو ماضی کی تصویر کھینچ سکتے ہیں اور نہ مستقبل کی پیش قیاسی کر سکتے ہیں اور نہ کوئی تمدنی ورثہ آئندہ پیڑیوں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں پھر بھی حشرات الارض کے سماج کے ارکان کے مقابلے میں ممیلین سماج کے ارکان میں سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

ممیلین سماج کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے سماجی برتاؤ میں لچک ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممیلین عضویے پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی کی صلاحیت پائی

جاتی ہے۔ مدتِ حیات بھی نسبتاً طویل ہوتا ہے اور غیر پختگی (immaturity) کا دور نسبتاً طویل ہونے کی وجہ سے انھیں اس کا موقع ملتا ہے کہ ماحول کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں۔ وہ کئی تمدنی نمونوں کو "trial and error" (آزمائش اور غلطی) کے ذریعے خود بخود سیکھ جاتے ہیں۔ چونکہ ان کا خون گرم (warm blooded) ہوتا ہے اس لیے والدین اور بچوں کے درمیان کافی عرصے تک ربط باقی رہتا ہے۔ اسی لیے والدین کے ذریعے وہ سماجی زندگی سے متعارف ہوتے ہیں۔

حیواناتِ اعلا کا سماج : PRIMATE SOCIETY

اس نوع سے تعلق رکھنے والوں میں زیادہ پیچیدہ عصبی نظام ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں میمل کے مقابلے میں زیادہ تیز، ان کا برتاؤ زیادہ لچک دار اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ بچپن کے طویل عرصے کی وجہ سے انھیں گروہی طریقوں کو سیکھنے کے لیے کافی وقت ملتا ہے۔ اس نوع سے تعلق رکھنے والوں میں اقتدار کا ایک نظام ہوتا ہے۔ اس گروہ کا ہر رکن بین عمل کے ذریعے اپنی طاقت کا اندازہ لگا کر دوسروں پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اسی اقتدار کی وجہ سے بہتر اور وافر غذا ملتی ہے۔ اسی طاقت کے بل بوتے پر نر ہو یا مادہ، بوڑھا ہو یا جوان سماجی نظام میں اپنے مقام کا تعین کر لیتا ہے۔

خاندانی گروہ میں اقتدار کی بنیاد عمر اور جنس ہوتی ہے۔ دوسرے گروہوں کے مقابلے میں خاندان میں مقابلے کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ یہ گروہ دوسرے سماجی گروہوں کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ چونکہ افرادِ خاندان کے تعلقات خونی رشتے پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے اور ایک دوسرے کو بیرونی خطروں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاندان کے مستحکم رہنے کی ایک اہم وجہ ماہرین یہ بتلاتے ہیں کہ نر اور مادہ میں ایک دوسرے کی طرف مسلسل رغبت پائی جاتی ہے۔

میمل کے مقابلے میں حیواناتِ اعلا میں ارتسالی میکانزم زیادہ ترقی یافتہ حالت میں پایا جاتا ہے۔ چہرے کے تاثرات اور جسم کی مختلف حرکتوں کے ذریعے وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کی آوازوں اور حرکتوں کا مطلب بھی سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح اپنے افعال و اعمال میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بندریا جب

اپنے بچّے کو نزدیک بُلانا چاہتی ہے تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح جب ایک جانور دوسرے پر غصّہ کرتا ہے تو وہ غُرّانے لگتا ہے۔ ان مختلف افعالی نمونوں کے پیچھے جو معنی مطلب پنہاں ہوتے ہیں وہ دوسرے جانور پر واضح ہوجاتے لیکن یہاں جو امر سماجیاتی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ایک جانور دوسرے جانور پر غصّہ تو کرسکتا ہے لیکن اس غصّے کا اظہار دوسرے جانوروں کے سامنے نہیں کرسکتا۔

حیوانات اعلا میں متوقّع علامتیں (anticipatory Symbol) ارتسال کا موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ پچھلے تجربوں کی مدد سے حال میں پیش آنے والے خطروں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مالک ڈنڈا لے کر کتے کے سامنے آئے تو وہ ڈنڈے کو دیکھ کر مالک کے منشا کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حیوانات اعلا میں دو قسم کی علامتیں بامعنی ہوتی ہیں۔

1۔ اظہاری علامتیں expressive symbol

2۔ متوقّع علامتیں anticipatory symbol

لیکن جہاں تک من مانی علامتوں (arbitrary symbol) کا تعلّق ہے حیوانات اعلا کے سماج میں فقدان پایا جاتا ہے۔ من مانی علامتوں کی مثال کے لیے لفظ 'جھوٹ' کو لیجیے۔ چاہے یہ لفظ لکھا جائے، کہا جائے یا اس کے ہجّے کیے جائیں جب تک کوئی واقعے یا عمل کا ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک اس کی توجیہہ من مانے طور پر کی جائے گی۔ من مانی علامتوں کے ذریعے ہم ان واقعات کا بھی ذکر کرسکتے ہیں جو ہمارے سامنے ظاہر نہیں ہوتے۔ ہم ہوائی قلعے باندھ سکتے ہیں، تخیّلی دُنیا میں کھوئے رہ سکتے ہیں اور پرستان کے قصّے سنا کر لوگوں کو محو کرسکتے ہیں۔ اس طرح گروہی تجربوں کو ایک پیڑی سے دوسری پیڑی میں منتقل کرسکتے ہیں۔

شبہِ انسانی گروہ (anthropoid groups) سے متعلّق رکھنے والے جتنے بھی اعلا قسم کے حیوانات ہوتے ہیں ان کا حیاتی۔ سماجی میکانزم انسانی گروہ سے مشابہ ضروری ہوتا ہے لیکن تمدّن کے فقدان کی وجہ سے ان میں اور انسانی سماج میں ایک زبردست خلیج حائل نظر آتی ہے کیونکہ تمدّن ہی انسانی برتری کی بھرپور توجیہہ ہے۔ تمدّن کے فرق کی وجہ سے دوسرے سارے فرق پیدا ہوتے ہیں۔ غرض تمدّن ہی وہ بامعنی انسانی خاصہ ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما نظر آتا ہے۔

انسانی سماج : HUMAN SOCIETY

یہ ضرور ہے کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے افراد میں بہت زیادہ فرق نظر آتا ہے۔ کوئی دُبلا ہے تو کوئی موٹا، کوئی کالا ہے تو کوئی گورا، کوئی لمبا ہے تو کوئی گُٹّا، کوئی محنتی ہے تو کوئی کاہل لیکن انسانی سماج میں بدنی خصوصیتوں (anatemical characteristics) کا فرق اتنا زیادہ اہم نہیں ہوتا جتنا کہ مختلف صلاحیتوں کی بناء پر تقسیم کار کا ایک پیچیدہ نظام پایا جاتا ہے۔ غرض مختلف پیشوں کا تعیّن کروانے میں تمدّن کا زبردست حصّہ ہوتا ہے۔ تمدّن ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ مختلف افراد کو مختلف پیشوں کے لیے تیار کروایا جاسکے جو بالآخر پیشہ وری گروہ کے قیام کا باعث بنتا ہے۔ اس لحاظ سے انسانی سماج میں جسمانی ساخت کی بناء پر کام کی تخصیص نہیں کی جاتی جیسا کہ حشرات الارض کے سماج میں ہوتی ہے بلکہ انسانی سماج افراد کی اس طرح نشو ونما کرتا ہے کہ افراد مروّجہ تمدّنی نمونوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسانی سماج کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر سماج میں شادی بیاہ کا ایسا طریقہ پایا جاتا ہے جسے سماج کی پسندیدگی حاصل رہتی ہے اور اگر کوئی فرد سماج کے ان مروّجہ طریقوں سے ہٹ کر عمل کرتا ہے تو اس پر سماجی کنٹرول عائد کیا جاتا ہے۔

انسان میں سیکھنے، سمجھنے اور اپنے خیالوں، تجربوں اور رُجحانوں کو دوسروں تک پہنچانے کی غیر معمولی صلاحیت موجود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ من مانی علامتوں یعنی arbitrary symbols کے ذریعے اپنی معلومات اور تجربوں کو آنے والی پیڑھی میں بآسانی منتقل کر سکتا ہے۔ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ وہ بات چیت کر سکتا ہے۔ اسے زبان کی ایسی دولت ملی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیالوں اور خوابوں کی واضح تصویر دوسروں کے سامنے کھینچ سکتا ہے اور غیر موجودہ واقعات اور اشیاء کا بھی دوسروں سے سُن کر یا پڑھ کر اس طرح کرتا ہے جیسا کہ وہ دیکھ چکا ہے مثلاً کسی جہاز کو بغیر دیکھے اور اس کی تباہی کے تجربے سے گزرے بغیر وہ خود بھی سمجھ لیتا ہے اور دوسروں کو بھی سمجھا سکتا ہے کہ جہاز کیا ہوتا ہے اور اس کی تباہی سے کتنا جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے؟

تمدّنی اکتساب (cultural learning) کی وجہ سے سیکھنے کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ تمدّن کے ہر شعبے میں اتنا تمدّنی ذخیرہ موجود رہتا ہے کہ اس کے سہارے افراد کسی بھی علم اور

فن کے شعبے میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی بھی فرد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے پسندیدہ فن کے آلات اور اوزار خود ہی تیار کرے بلکہ اسے اپنے پیشروؤں کے ذخیرے سے کافی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی موسیقی میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے تو نہ اسے موسیقی کے آلات بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ موسیقی کے اصول دریافت کرنے کی بلکہ اسے صرف اپنے وقت اور جانکاری کا صحیح استعمال اس فن کو ذہن نشین کرنے اور مشق جاری رکھنے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ زبانی اور تحریری طور پر جس طرح رہنمائی کی جاتی ہے اس پر دھیان دینا پڑتا ہے۔ غرض گذشتہ تجربوں کی وجہ سے اکتساب کا عمل کافی مختصر اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

تمدّن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمدّنی سرمایہ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر پیڑی اپنے تجربوں، تحقیق اور معلومات سے تمدّنی ورثے میں قابلِ لحاظ اضافہ کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے نئی پیڑی کو بہتر سے بہتر معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

انسانی سماج کی یہ خصوصیت بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ہر فرد کو تمام علوم اور فنون سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ہر سماج میں انتخاب کے اتنے زیادہ مواقعے رہتے ہیں کہ ہر فرد اپنی فطری میلانوں اور مفادوں کو پیشِ نظر رکھ کر کسی ایک شعبے میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے گھر تعمیر کروانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ فنِ تعمیر یا فن بخاری میں مہارت حاصل کرے اور نہ موٹر چلانے کے لیے اسے موٹر کے پورے میکانزم سے واقف ہونا پڑتا ہے بلکہ اس سلسلے میں افراد ایک دوسرے کی معلومات، تجربوں، کارکردگی اور تمدّنی ورثے سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمدّنی ورثہ کسی ایک فرد کی میراث نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کا اثاثہ ہوتا ہے، قوم کی پونجی ہوتی ہے جس کے حصّہ دار سماج کے تمام افراد ہوتے ہیں۔

جب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ تمدّن سماج کا ترکہ ہے، نہ کہ کسی فردِ واحد کا۔ اس لحاظ سے فرد کی بقا کا انحصار بالکلیہ اس کی شخصی صلاحیتوں، عقل اور فہم عامہ پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ تمدّنی سطح (cultural level) پر زندگی کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس لیے ہر گروہ مہارت ہی نہیں بلکہ فوق مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ دوسرے گروہ پر سبقت لے جا سکے۔ ایسی صورت میں پست گروہ کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ یا تو وہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں اپنے آپ کو بالکل نیست و نابود کر دے یا غالب تمدّن dominant culture کے عنصروں کو اپنا لے۔ اس لحاظ سے برتر تمدّن کا تسلّط قائم رہتا ہے۔ غرض قدرتی انتخاب (natural selection)

کا یہ عمل جو کہ تمدنی سطح، نہ کہ انفرادی سطح، پر چلتا رہتا ہے افراد پر اس قسم کا ذہنی اور نفسی بار ڈالتا ہے کہ وہ آگے بڑھنے کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب کہ تمدنی برتری کی بنا پر مختلف قوموں نے اپنا لوہا منوایا۔ اس لحاظ سے انسان کی برتری کا راز ان کے کارناموں میں مضمر ہے نہ کہ جسمانی بل بوتے پر۔

تمدن میں ذخیرہ کا ایک اہم ذریعہ فنِ تحریر ہے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے، برس ہا برس تک، انسان اپنے تمدنی ورثے کو آنے والی پیڑیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل کرتا رہا ہے جسے "word - by - mouth process" کہا جاتا ہے۔ اگر کسی واقعہ کو دُہرانے کے لیے دماغ پر بار بھی ڈالا جائے تو خود حافظہ اتنا اچھا ہونا چاہیے کہ ہر بات بر وقت یاد آجائے جس کے لیے دماغ میں اخذ کرنے اور محفوظ رکھنے کی زبردست صلاحیت ہونی چاہیے۔ سیکھنے اور سکھانے والے کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

تحریر کے ذریعے افراد ایک دوسرے کو ہزارہا میل دُور ہونے کے باوجود اپنے خیالوں اور مسلکوں سے واقف کرا سکتے ہیں۔ یہ تحریر کا کرشمہ ہے کہ خیالات کو تسلسل کے ساتھ محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر مختلف محققوں کے خیالوں کو اکٹھا کر کے تحقیق کے لیے نئی راہوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ موجودہ سائنسی تحقیقیں اپنے پیشروؤں کی بڑی حد تک مرہونِ منت ہیں۔ غرض تحریر کی بدولت مہارت کا میدان زیادہ وسیع اور زرخیز ہو جاتا ہے۔

انسانی سماج میں تحریر کی وجہ سے علامتی ارتسال بہت زیادہ بامعنی نظر آتا ہے۔ اس سلسلے کی کئی ایجادیں مثلاً چھپائی، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور ٹیلی ویژن ہیں جن کی بدولت انسانی تہذیب و تمدن میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ تہذیب کو فروغ دینے میں تعداد اور نوعیت دونوں اہم ہیں۔

انسانی سماج میں معیار اور اقدار (norms & values) کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ ہر انسانی سماج میں انسانی برتاؤ پر کنٹرول رکھنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جو وقت اور موقع محل کے اعتبار سے لاگو کیے جاتے ہیں۔ سماج کے ہر فرد کے ذہن میں ترغیبی اور تشددی طریقوں کا ایک واضح نقشہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ان افعالی نمونوں سے باز رہتا ہے جو قابلِ ملامت قرار دیے جاتے ہیں اور ان نمونوں کو اپنانے کی کوشش کرتے جو خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

اگر انسان کو دوسروں کے اعتراض کی پروا نہ ہوتی تو معیاری کنٹرول یا normative control کی ضرورت ہی نہ پڑتی، لیکن شخصیت کی تشکیل کا دار و مدار ان ہی سماج کے معیارات پر مبنی ہے۔ جو رائے وہ دوسروں کے بارے میں رکھتا ہے اور اس کے بارے میں جو رائے دوسروں کی ہوتی ہے وہ اہم عنصر ہیں جو شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ غرض انسانی سماج اخلاقی قدروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

انسانی سماج میں اقتدار کا بھی زبردست رول ہوتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہر با اقتدار شخصیت اخلاقی اور سماجی معیاروں کی پابند نہیں ہوتی حالانکہ نظری طور پر وہی با اقتدار شخصیت سمجھی جاتی ہے جس کی زندگی صحت مندانہ اصولوں کی غمازی کرے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ با اقتدار شخصیتیں اپنی جائز قوت کا ناجائز طریقوں سے استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے کئی بدعنوانیاں جیسے رشوت، استحصال، ظلم اور زیادتیاں پیدا ہوتی ہیں۔

غرض انسانی سماج کے مطالعے کے لیے ہمیں نہ صرف واقعات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے بلکہ ان واقعات اور حالات سے وابستہ جو اخلاقی قدریں اور سماجی معیار ہوتے ہیں ان کی واضح تصویر بھی ہمارے سامنے ہونی چاہیے کیونکہ انسانی سماج کی اساس سماج۔ تمدّنی ہوتی ہے جس میں سماجی قدروں کا دخل ہوتا ہے۔

بالآخر ہم اس طویل بحث سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مختلف سماجوں میں امتیاز اس لیے ممکن ہے کہ ہر سماج اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے علاحدہ طریقے اختیار کرتا ہے دوسرے لفظوں میں کوئی سماج تو اپنی میکانزم کی بناء پر اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے تو دوسرا سماج تمدّنی ورثے کی بناء پر۔ اس لحاظ سے پہلے درجے میں حیوانی سماج کا شمار ہوتا ہے اور دوسرے درجے میں انسانی سماج داخل ہے۔ ان دونوں سماجوں میں ایک بدیہی فرق یہ ہے کہ حیوانی سماج میں جبلت کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے اور ان میں نامیاتی تخصیص پائی جاتی ہے لیکن اعلا درجے کے حیوانوں میں اکتسابی صلاحیت بہت زیادہ نمایاں رہتی ہے جو انسانی سماج میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔

فہرستِ کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا۔

1. Mac Iver "Society." p.7.

2. Ellwood, C.A: "A History of Social philosophy." p.538.

3. Dressler: "Sociology." p.48.

4. Ibid. P.48.

5. Ibid. P.69

6. Ibid. P.69

7. David, K: "Human Society."

تیسرا باب

نظامِ فطرت اور انسانی سماج

THE NATURAL ORDER AND THE HUMAN SOCIETY

کسی بھی سماج کا وجود خلاء میں نہیں بلکہ روئے زمین کے کسی نہ کسی حصّے پر ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں سطحِ زمین کے جس حصّے پر سماج کی تشکیل ہوتی ہے اس کے جغرافیائی ماحول کا اس سماج کی ساخت اور فعلیت پر اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ سماجیات کے مفکرین عرصہ دراز سے اس امر کی وضاحت میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی بھی سماج کا تجزیہ اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ جغرافیائی عوامل کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جغرافیائی عوامل کی اہمیت جتلانے میں مفکرین غلو کر گئے ہیں۔ اگر ایک دبستان جغرافیائی جبریت (Geographical determinism) کا قائل ہے تو دوسرا یہ کہہ کر جغرافیائی عوامل کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ "جہاں کسی وقت یونانی رہتے تھے اب وہاں ترک رہتے ہیں۔"

جغرافیائی عوامل : GEOGRAPHICAL FACTORS

سماجی علوم میں ایک مشہور دبستان ہے جس کے پیرو جغرافیائی جبریت کے قائل ہیں اس سلسلے میں سب سے اہم نام ہپوکریٹس (Hippocrates) کا ہے جس نے اپنی مشہور کتاب :

"Airs, water's and places."

میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی عادات و اطوار کی تشکیل میں جغرافیائی عوامل کا زبردست دخل ہے اور انسان کی عادات و اطوار کی جھلک حکومت کے ادارے میں بھی دکھائی

دیتی ہے۔ اس مفکّر کا خیال ہے کہ یورپ کے لوگوں کی جانداری، بہادری اور محنت پسندی دراصل اس کی آب و ہوا کا نتیجہ ہے۔ بہرحال جس ملک کی آب و ہوا معتدل ہوتی ہے وہاں کے افراد کی طبیعتوں میں بھی اعتدال پایا جاتا ہے اور جس ملک کی آب و ہوا سخت ہوتی ہے وہاں کے افراد کی طبیعتوں میں تیزی پائی جاتی ہے۔

ارسطو جسے یونان کا سب سے زبردست مفکّر سمجھا جاتا ہے وہ اس بیان کو بغیر کسی بحث و تکرار کے قبول کر لیتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ شمال کے لوگ بڑے جوشیلے ہوتے ہیں، لیکن ذہانت کے اعتبار سے اتنے کم کہ ان سے کسی اچھی سیاسی تنظیم کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مقابلے میں جنوب کے لوگ ذہین اور اُپچی (incentives) ہوتے ہیں لیکن ان میں اسپرٹ اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ غلاموں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ یونان نہ شمال میں ہے اور نہ جنوب میں اس لیے وہاں کی آب و ہوا بہترین ہے جس کی وجہ سے یونانیوں میں جانداری بھی ہوتی ہے اور ذہانت بھی، لہٰذا وہی دُنیا پر حکومت کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات روم کے دو مشہور مفکّرین وٹرو ولیس اور پلینی (Vitruvis & Pliny) کے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ سرد ممالک میں جسم سے پسینہ نہیں نکلتا جس کی وجہ سے شمال کے لوگوں کا قد دراز، رنگ گورا، بال سیدھے اور بھورے اور آنکھیں سُرمئی ہوتی ہیں۔ خون کی زیادتی کی وجہ سے وہ بہادری سے جنگ میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جنوب کے لوگوں میں خون کی کمی ہوتی ہے۔ جسم سے پسینہ نکلتا رہتا ہے۔ سُورج ان کے جسم کی رطوبت کو چوس لیتا ہے اس لیے ان کا قد چھوٹا، رنگ کالا، آنکھیں کالی، بال گھنگھریالے اور پیر مضبوط ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے مفکّرین کے لیے یہ تمام خیالات تصوری ضرور ہیں، لیکن سماجیات کی تاریخ میں ان مفکّرین کا ذکر ضرور ملتا ہے جنھوں نے جُغرافیائی عوامل کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔ موجودہ زمانے کے مفکّرین اس موضوع کا مطالعہ زیادہ سنجیدگی اور زیادہ سائنسی بُنیادوں پر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مفکّر وکٹر کوزن (Victor Cousin) کا کہنا ہے کہ اگر کسی ملک کا طبعی جُغرافیہ اسے سمجھا دیا جائے تو وہ بآسانی کہہ سکتا ہے کہ اس مُلک کی تاریخ کیا ہوگی اور دُنیا میں اس ملک کا مقام کیا ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ سماجیاتی ادب میں "Geographical Interpretation of History"

یعنی تاریخ کی جغرافیائی تاویل کافی اہمیت رکھتی ہے۔ مشہور ماہر سماجیات پٹرم سارو کن (Pitrim Sorokin) اپنی کتاب "Contemporary Sociological Theories" میں کہتا ہے کہ طبعی ماحول سے مراد ایسا ماحول ہے جس میں انسانی کوششوں اور کاوشوں کا کوئی دخل نہ ہو یعنی جس میں انسان نے اپنے آرام اور سہولت کی خاطر تبدیلی نہ کی ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ عوامل جو زمین کی گردش کا باعث ہوتے ہیں۔ نظامِ شمسی میں زمین کی حیثیت کا تعیّن کرتے ہیں اور وہ تمام نامیاتی عنصر جو زمین کی ساخت میں مدد دیتے ہیں طبعی ماحول میں داخل ہیں۔ غرض سمندر سے قربت یا دُوری، سلسلۂ کوہ، درجہ حرارت، چٹانوں کی سختی، زمین کی زرخیزی، گھنے جنگل، سرسبز شاداب وادیاں، معدنیات، وسیع ہموار میدان، دریاؤں کا جال، پانی کا کال یہ سب جغرافیائی عوامل دولت کے سرچشمے ہیں۔ یہ عوامل انسان کی ذہنی کاوشوں اور جسمانی جدوجہد کا نتیجہ نہیں۔ نہ تو ان کے اضافے میں انسان کی کوششوں کا دخل ہے اور نہ ان کی کمی پر انسان کا اختیار ہے۔ چونکہ ان جغرافیائی عوامل کی فہرست کافی طولانی ہے اس لیے ان کے مطالعے میں چار عوامل کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے جس میں زمین کی حرکت، پانی اور زمین کی تقسیم، آب و ہوا اور قدرتی ذریعے شامل ہیں۔

یہاں پر یہ نکتہ وضاحت طلب ہے کہ دُنیا کے کسی بھی خطّے میں بسنے کے لیے جغرافیائی ماحول کا سازگار ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو مونٹ ایورسیٹ پر کسی سماج کا وجود ہے، نہ دریاؤں میں، نہ تو صحرائے اعظم، میں لوگ بستے ہیں اور نہ برف کے تودوں پر۔ زمین کی ساخت اور قابلِ زراعت زمین کا اثر آبادی کی گنجانی پر پڑتا ہے۔ غرض جغرافیائی عوامل مختلف تحدیدیں عائد کرتے ہیں۔ جغرافیائی عوامل کی وجہ سے حدود کا تعیّن عمل میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مخصوص جغرافیائی حالات انسانی سماج کی بقار کے ذمّہ دار ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ابتدا، ارتقار اور پھیلاؤ میں جغرافیائی عوامل کا زبردست رول رہا ہے یہی وجہ ہے کہ یونان کے قدیم فلسفی ہپوکریٹس (Hippocrates) سے لے کر موجودہ زمانے کے امریکی مفکّر ہنٹنگٹن (Huntingten) اور انگریز مفکّر ٹوین بی (Toyn bee) تک اس موضوع پر تحقیق کرتے رہے ہیں کہ مختلف سماجوں میں ترقّی کے اعتبار سے اتنا زیادہ فرق کیوں پایا جاتا ہے؟ یہ فرق اتنا واضح ہے کہ بعض سماج ترقّی یافتہ اور مہذب ہوگئے اور بعض اب تک قدیمیت (Primitivism) کا شکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترقّی یافتہ سماج

سائنس اور ٹیکنالوجی سے مستفید ہو رہے ہیں اور قبائلی سماج اب تک پرانی روایتوں اور قدیم ریت رسموں میں گھرے ہوئے ہیں۔

ٹوین بی (Toynbee) کا خیال ہے کہ متمدن سماج دراصل انسان کی اس لامتناہی اور ان تھک جدوجہد کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں جس کی وجہ سے ہم پر اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسان طبعی ماحول پر قابو پاکر اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس لحاظ سے ٹوین بی طبعی ماحول کی مطلق برتری کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسے دو رخی سلسلہ قرار دیتا ہے جس کی بنا پر اگر وہ ایک طرف طبعی ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے اس ماحول پر قابو پانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ انسان نہ تو پانی کی مقدار میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ زمین کی۔ نہ تو وہ موسموں کی مدت میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کمی۔ نہ تو وہ سورج کی حدت میں کمی کر سکتا ہے اور نہ بیشی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں قدرتی مظاہر ایسے ہیں جن کی تعداد اور مقدار میں اضافہ یا کمی ممکن نہیں۔ اسی طرح ان کے اثرات میں شدت یا کمی کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برخلاف انسان کو بہترین زندگی گزارنے کے لیے ان قدرتی مظاہر سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے اور وہ نئی ایجادوں کے ذریعے انھیں تعمیری اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

غرض انسانی سماج پر جغرافیائی عوامل ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ وہ انسانی جدوجہد پر تحدیدیں ضرور عائد کرتے ہیں لیکن ان کا تعین (determination) نہیں کر سکتے۔ جغرافیائی عوامل مقابلتاً مستقل ہوتے ہیں لیکن سماجی حالات اور سماجی مظہر تغیر پذیر۔ اس لحاظ سے جغرافیائی مظاہر اور سماجی مظاہر کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جغرافیائی عوامل کو نظر انداز کر دینا ایک سماجیاتی غلطی ہے لیکن انھیں سماجی زندگی پر مسلط کر لینا بھی بالکلیہ صحیح نہیں یہی وجہ ہے کہ جس طرح انسانی سماج پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ تمدنی ورثے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت انسان بہت کچھ جغرافیائی عوامل پر قابو پا چکا ہے۔

حیاتیاتی عوامل : BIOLOGICAL FACTORS

جس طرح جغرافیائی جبریت کے حامی جغرافیائی عوامل کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں اسی

طرح حیاتیاتی عفویت (biological organism) کے قائل مفکرین جنینی مرکبات (genetic compounds) کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح جغرافیائی مظاہر کی تعداد میں کمی بیشی ممکن نہیں اسی طرح حیاتیاتی عوامل اس طرح جسمانی ساخت کا تعین کرتے ہیں کہ اس میں ردّ و بدل ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والی پیڑی کے قد و قامت میں چند انچوں کا اضافہ ممکن ہے اور نہ کمی۔ لہٰذا ہمیں اس امر پر غور کرنا پڑتا ہے کہ تاریخی واقعات پر حیاتیاتی اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں؟ انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویے میں کس حد تک مشابہت اور عدم مشابہت پائی جاتی ہے؟ نسل نسلی اختلافات اور مخلوط النسل کا انسانی سماج میں کیا رول ہے؟ دماغ کا سائز اور عقل و فراست، اناٹومی اور کردار، اناٹومی اور جرم میں کیا تعلق ہے؟

حیاتیاتی عوامل سے ہماری مُراد اس جنینی ترکیب (genetic censtitution) سے ہے جس کا تعلق انسانی عضویے سے ہے۔

عضویت اور عضویاتی تمثیلات : ORGANISM AND ORGANIC ANALOGIES

1859ء میں ڈارون نے "Origin of Species" کے موضوع پر ایک کتاب شایع کی جس کا اثر نہ صرف حیاتیات (Biology) پر پڑا بلکہ سماجیاتی ادب میں بھی وہ تمام اصطلاحیں استعمال ہونی شروع ہوئیں جو حیاتیات سے لی گئی تھیں مثلاً عضویت (organism)، توارث (heredity)، انتخاب (Selection)، اختلافات (Variation)، مطابقت (Adjustment) موزوں ترین کی بقاء (Survival of the fittest) طفولیت (parasitism) اور ماحولیات (ecology) وغیرہ۔

یورپی مفکرین نے قدیم زمانے سے ریاست کو ایک عضویہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے آخری دہے اور بیسویں صدی کی ابتدا میں اس خیال کے حامی کئی مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے سماج میں حیاتیاتی خصوصیتوں کا پتہ چلایا جیسے کثرت تعداد، بالیدگی، امتیاز، بیماری، موت، نیا جنم، مختلف حصّوں کا انضمام، مختلف حصّوں کا اتصال، ساختی کاملیت اور تغیر کلی وغیرہ۔

ان مفکرین کے خیالات کے مطابق خلیہ (cell) ایک بنیادی اکائی ہے۔ خلیوں کی پیچیدہ

شکل ریشے (tissues) ہیں، ریشوں کی پیچیدہ شکل عضویے ہیں، عضویوں کی پیچیدہ شکل افراد ہیں اور افراد کا پیچیدہ نظام سماج ہے۔ لہٰذا عضویے کی ترقی یافتہ شکل سماج ہے۔ یہاں پر عضویے سے مراد ایسا زندہ مادّہ ہے جس میں مخصوص خارجی حالات میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

سماجیاتی ادب میں ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کا نام نظریۂ عضویت (Theory of Organism) کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں ایک باب "A Society is an organism" کے عنوان پر لکھا ہے۔ اس باب میں حیاتیاتی عضویوں اور سماج کے مابین جو مشابہتیں اور عدم مشابہتیں پائی جاتی ہیں ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ وہ حیاتیاتی عضویوں اور سماج میں چار مشابہتوں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً

1: حیاتیاتی عضویوں اور سماج میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔
2: ان دونوں کے حصّوں (Parts) میں پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔
3: ان دونوں کے مختلف حصّوں کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔
4: افراد اور حیاتیاتی عضویے آزادانہ طور پر اپنا فعل انجام دیتے رہتے ہیں۔

جس طرح سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں مشابہتیں پائی جاتی ہیں اسی طرح وہ چار طرح سے ایک دوسرے سے غیر مشابہہ ہوتے ہیں۔

1: سماج کی کوئی واضح شکل نہیں ہوتی۔
2: سماج کی اکائیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جب کہ حیاتیاتی عضویے کی اکائیوں کا تعیّن جسم میں قطعی طور پر ہو جاتا ہے۔
3: سماج کے مختلف اجزاء کا کوئی مخصوص مقام نہیں ہوتا۔
4: سماج کا ہر فرد حس اور عقل کا مرکز ہوتا ہے۔

ان عدم مشابہتوں کی بناء پر اسپنسر سماج کو فوق عضویہ یا Super organism کہتا ہے۔ اسپنسر کا خیال ہے کہ جس طرح عضویہ میں

طاقت بخش نظام Sustaining System
تقسیمی نظام distributing System

اور تنظیمی نظام یعنی regulating system پایا جاتا ہے اسی طرح سماج میں طاقت بخش نظام کا ڈھانچہ پیدا آور صنعتوں پر قائم ہے جس کا تعلق مادی دولت سے ہوتا ہے اور جس کا وجود سماج کی بقاء کے لیے ضروری ہے۔ تقسیمی نظام میں اسپنسر تمام حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذریعوں کا شمار کرتا ہے اور تنظیمی نظام میں وہ نہ صرف سیاسی نظام کو شامل کرتا ہے بلکہ کنٹرول کے تمام ذریعے داخل ہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution)، قدرتی انتخاب (Natural Selection) اور موزوں ترین کی بقاء (Survival of the fittest) کا اطلاق نہ صرف سماج کے ارتقاء اور نشو ونما پر کیا جا سکتا ہے بلکہ ادب، فن، موسیقی، فلاسفی، سائنس اور مذہب پر بھی ان نظریوں کی صداقت کو جانچا جا سکتا ہے۔ سماجیات کی تاریخ میں ارتقاء کے نظریے کے سلسلے میں ڈارون اور اسپنسر کے دو کلیدی نام (Key names) ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ موجودہ زمانے میں ان نظریوں کی اہمیت گھٹ رہی ہے لیکن ایک عرصے تک سماجی ساخت کی تشریح کے لیے حیاتیاتی نظریوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔

حیاتیاتی عوامل میں نسل ایک اہم عامل ہے، کیونکہ نسل اور نسلی امتیاز کا موضوع نہ صرف علمی اور سائنٹفک مباحث تک محدود ہے بلکہ تاریخ کے ہر دور میں نسلی برتری اور کمتری کے احساس پر مبنی بڑے خوفناک واقعات پیش آتے رہے ہیں: حالانکہ سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کا تعلق ایک ہی نوع "hemo Sapiens" سے ہے۔ اسی سائنسی تحقیق کی روشنی میں وہ تمام خیالات بے بنیاد اور غلط ثابت ہو چکے ہیں جو اس امر کے دعویدار تھے کہ تمام متمدن اور تہذیب یافتہ سماجوں کا تعلق بہتر نسلوں سے ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ تصورات محض خیال آرائیوں کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مقدس کتابوں، کلاسیکی ادب اور فلسفے میں بھی اس قسم کے حوالے ملتے ہیں۔

انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی مفکر کورٹ آرتھر دے گوبنیو (Court Arthur de Gobineau) کی کتاب "Essi sur l'inegabite' des racai humanies" سنہ 1853ء اور سنہ 1855ء کے درمیان چار جلدوں میں شایع ہوئی جس میں قابل مصنف نے اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ دنیا کی تمام نسلیں مساوی درجے کی حامل نہیں۔ کوئی برتر ہے اور کوئی کمتر۔ برتر نسلیں تہذیب اور تمدن کی علم بردار ہیں اور کمتر نسلیں تعمیر ذلت

میں پڑی ہوئی تھی۔ ہزاروں سال سے ان کا وجود ہے لیکن ان کے سماجی اداروں میں کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں ہوا۔ لہٰذا دے گوبینو اس خیال کا حامی ہے کہ کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا دارو مدار جغرافیائی عوامل پر نہیں ہے بلکہ وہ سراسر نسلی خصوصیات پر مبنی ہیں۔ دے گوبینو کے نزدیک برتر نسلیں ناردی، آرین اور تمام گوری نسلیں ہیں جو دوسری نسلوں سے اختلاط اور انجذاب کی بناء پر اپنی نسلی انفرادی برتری کھو بیٹھی ہیں۔

حیاتیاتی عوامل میں بڑا زبردست رول دماغ کا ہے اور ظاہر ہے دماغی صلاحیتوں کا اثر براہ راست انسانی افعال، انسانی کارناموں اور واقعات کی نوعیت پر پڑتا ہے۔ رچرڈ لیون شون (Richard Lewinsohn) نے جو کتاب "Animals, Men and Myths" پر لکھی ہے اس میں انھوں نے یہ بتلایا ہے کہ دُنیا کے سب سے قدیم آدی باسی جو ہتھیار اور اوزار استعمال کرتے تھے ان کے بھیجے کا حجم تقریباً ایک ہزار کیوبک سینٹی میٹر تھا جب کہ چمپینزی کے بھیجہ کا وزن صرف چھ سو کیوبک سینٹی میٹر تھا۔ اسی مُصنّف کا کہنا ہے کہ ہم کو صرف دماغ کے حجم پر غور نہیں کرنا چاہیے بلکہ جسمانی وزن کے ساتھ دماغی تناسب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

پتھرائی ہوئی شہادتوں (Fossilized evidences) سے پتہ چلتا ہے کہ 200'000 برسوں سے انسانی دماغ میں وزن کے لحاظ سے کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں ہوا ہے۔ نیندرتھال انسان کے دماغ کی سائز اتنی ہی تھی جتنی کہ موجودہ انسان کی ہے۔ لہٰذا نیندرتھال انسان بھی معاشی، تعلیمی، سیاسی، تفریحی اور مذہبی مشاغل میں اسی طرح حصّہ لے سکتے تھے جتنا کہ ہم لوگ لیتے ہیں۔ غرض یہاں پر جو سوال اہم ہے وہ یہ کہ کس طرح انسان اپنی دماغی صلاحیتوں کو بہتر طریقے پر استعمال کر سکتا ہے نہ کہ دماغ کے حجم میں اضافہ ہونے سے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بہترین غذاؤں کے استعمال، رہنے سہنے کے عمدہ طریقوں، طبی امداد کی سہولتوں، موذی اور متعدی امراض پر قابو پانے کی بدولت جسمانی اعتبار سے موجودہ پیڑی بہت بہتر ہے۔

یہ تسلیم شُدہ حقیقت ہے کہ بعض حیاتیاتی عوامل انسان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور بعض مخالف۔ مثال کے طور پر جو جو لوگ ذہین ہوتے ہیں اور جن میں خداداد صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے علم ریاضی اور طبیعات کے پیچیدہ مسئلوں کو بھی تھوڑی بہت کوشش سے حل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں میں

فن موسیقی کا خداداد ملکہ ہوتاہے وہ ساز اور سُر کے اُتار چڑھاؤ سے محفوظ ہوتے ہیں۔

نفسیات کے ماہرین ایک عرصہ دراز سے جسمانی ٹائپ اور افتاد طبع (temperament) کے باہمی تعلق کا مطالعہ کرتے آئے ہیں۔ جن کی بنا پر یہ عام خیال چلا آ رہا ہے کہ انسانی جسم چار رطوبتوں کا مرکب ہے: خون، بلغم، صفرا (کالا) صفرا (پیلا) (black bile & yellow bile) انسان کا مزاج ان مرکبات کا تابع ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی تقسیم

دموی مزاج	Sanguine
بلغمی مزاج	Phlegmatic
صفراوی مزاج	Melancholic
تنک مزاج	Choleric

میں کی گئی ہے۔ ان ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جن لوگوں میں خون کی زیادتی ہوتی ہے ان میں خوداعتمادی ہوتی ہے اور قوی، جوشیلے، پھرتیلے اور زندہ دل ہوتے ہیں۔

جن کا مزاج بلغمی ہوتاہے وہ بُزدل اور کاہل ہوتے ہیں۔

صفراوی مزاج والے قنوطی اور پست ہمت ہوتے ہیں اور تنک مزاج والے غصیلے اور چڑچڑے ہوتے ہیں۔

اس قسم کی تقسیم جو ہپوکریٹس (Hippocrates) کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اس کی جھلکیاں شکسپیر کے ڈراموں میں بھی نظر آتی ہے۔

سماجیات کے ماہرین کی دلچسپی کا مرکز محض جسمانی ٹائپ سے مزاج اور شخصیت کا اندازہ لگانا نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص سماجی مظاہر کا مطالعہ۔ مثال کے طور پر جو بطور خاص یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا ایسا کوئی حیاتیاتی عنصر ہے جو کسی خاص سماجی مظہر جیسے جرم وغیرہ کا باعث ہوتاہے؟

اس موضوع پر جس سماجی مفکر نے سب سے پہلے غور کیا وہ اٹلی کا محقق کیسرے لام بروسو (Cesare Lombroso) تھا۔ اس کی تحقیق کے مطابق بعض مخصوص جسمانی خصوصیتوں کو دیکھ کر مجرم کی نشان دہی کی جا سکتی ہے مثلاً ڈھلوان پیشانی، آگے نکلا ہوا جبڑا، موٹی بھویں، بالوں کی زیادتی یا کمی۔ لام بروسو کا یہ نظریہ اب زیادہ قابل قبول نہیں رہا لیکن جرمیاتی انسانیات (Criminal Anthropology) کی تحقیقوں میں اس نظریے سے بہت زیادہ مدد ملی

گئی ہے۔ لام بروسو کی تحقیق کے بعد جس مفکر کا نام اس موضوع پر تحقیق کرنے کی وجہ سے مشہور رہا ہے وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے جسمانی انسانیات (Physical Anthropology) کے پروفیسر ایرنسٹ اے ہوٹن (Earnest A. Hooten) تھے۔

ہوٹن اور ان کے ساتھیوں نے تقریباً لگاتار بارہ سال تک مجرموں اور غیر مجرموں کی جسمانی ساخت کے فرق کا مطالعہ کیا انھوں نے سینہ کی چوڑائی سر کے گھیر، بالائی چہرے کی اونچائی ناک کی اونچائی کانوں کی لمبائی وغیرہ سے یہ وضاحت کی کہ غیر مجرموں کے مقابلے میں مجرموں کی یہ جسمانی خصوصیتیں ناقص (deficient) حالت میں تھیں۔ ان کی تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ میڈیٹیرین ٹائپ (Mediterranean Type) میں قتل اور زنا کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں جب کہ نادری ٹائپ (Nordic Type) میں رشوت ستانی، فریب، بے ایمانی اور جعل سازی بہت عام ہے۔ ہوٹن کے ان خیالوں پر ماہر جُرمیات ایڈون ایچ سدرلینڈ (Edwin H. Sutherland) نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی جسمانی ساخت مختلف ہوتی ہے اور عورتوں کے مقابلے میں مرد دس گنا جُرم زیادہ کرتے ہیں لہٰذا اس مفروضے کی رُو سے انھیں انسانی آبادی سے خارج کر دینا چاہیے۔

مختلف رایوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اب کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کا قطعی اطلاق مجرموں کا پتہ چلانے کے لیے کیا جا سکے اور جسے سائنسی بنیادوں پر قبول کر لیا جا سکے۔ اب تک مجرموں کے افعال اور اعمال کو ان کی جسمانی ساخت سے مربوط کرنے کی جو سنجیدہ تحقیقیں بھی ہوئی ہیں اس پر شک وشبہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے نتیجے محض اتفاقیہ طور پر ظاہر ہوئے ہیں کیونکہ ہر ڈھلوان پیشانی والے کے جُرم کا ارتکاب کرنا ضرور نہیں ہے اگر ہم ایسا سمجھ لیں تو پھر یہ بات ہوگی کہ ہم لمبی انگلیاں والے کو بہترین سرجن، موٹے آدمی کو ہنس مکھ، سُرخی مائل رنگ والے کو غصیلا اور زرد رنگت والے کو شاعر سمجھ لیں۔ یہ تمام تصوّرات فرضی داستانوں میں تو بآسانی کھپ سکتے ہیں لیکن سماجیات کے سائنسی مطالعے کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

آبادیاتی عوامل: DEMOGRAPHIC FACTORS

دو قسم کے قدرتی حالات (natural Condition) کا اثر انسانی سماج کی ساخت اور فعلیت پر پڑتا ہے جن میں سے ایک جُغرافیائی اور دوسرا حیاتیاتی عامل ہے۔ جُغرافیائی اور حیاتیاتی عوامل کو قدرتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی کمی بیشی انسان

کے بس کی بات نہیں۔ ان دونوں عوامل کے علاوہ ایک تیسرا عوامل آبادیاتی (demographic) کہلاتا ہے جس پر انسان قابو پاسکتا ہے۔ ان عوامل کا اثر انسانی سماج کی تشکیل پر بہت زیادہ مرتب ہوتا ہے۔

"demos" کے معنی "لوگ" کے ہیں جس کا تعلق بالکلیہ افراد کی تعداد سے ہے۔ اس لحاظ سے آبادیات کا علم شماریات یا Statistics سے بحث کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آبادیات یعنی demography میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ کرۂ ارض پر لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ چند سال پیشتر کتنے لوگ بستے تھے؟ ایک ہزار یا سو سال پہلے کتنے لوگ تھے؟ آئندہ سال لوگوں کی تعداد میں کتنی کمی بیشی ہوسکتی ہے؟ اس قسم کے شماریاتی اندازوں سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ ہر سال کی شرح پیدائش اور شرح اموات کیا ہے؟ دُنیا کے مختلف حصّوں میں آبادی کتنی ہے؟ بعض علاقے بہت زیادہ گنجان کیوں ہیں؟ اور بعض علاقوں میں آبادی کیوں کم ہے؟

ماہرین آبادیات نے اس بات کا پتہ چلایا ہے کہ دُنیا میں جتنے بھی لوگ بستے ہیں ان کی آدھی تعداد زمین کے صرف پانچ فیصد حصّے پر رہتی ہے اور زمین کے تقریباً 75 فیصد حصّے پر 5 فیصد سے بھی کم لوگ بستے ہیں۔ اس کے علاوہ مستقل طور پر لوگ ایک ہی جگہ نہیں بستے بلکہ وہ نقلِ مقام کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے مختلف علاقوں میں آبادی کا تناسب بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ بعض سماجوں میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ بعض سماجوں میں معکوس حالت۔ بعض سماجوں میں عورتوں کے مقابلے میں بچوں کے مقابلے میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور بعض سماجوں میں اس کے برعکس۔ بعض سماجوں میں متجانس (Hemogenous) آبادی ہوتی ہے اور بعض میں غیر متجانس (Hetrogenous)۔ بعض سماجوں میں شادی شُدہ افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں کم۔ یہ اور اسی سے ملتے جُلتے موضوع آبادیات کے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور یہی سوالات سماجیات کے ماہرین کی دلچسپی کا بھی باعث ہوئے ہیں۔ کیونکہ آبادی کا مسئلہ سماجیات کا اہم موضوع بحث ہے۔ اس علم کا جتنا زیادہ غیر جانبداری اور سائنٹفک بنیادوں پر مطالعہ کیا جاتا ہے اتنے ہی وثوق کے ساتھ نتیجوں کو اخذ کیا جاسکتا ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ آبادی کے مطالعہ میں بھی غیر سائنسی داخل ہوجاتے ہیں اور وہ بھی ماہرین شماریات کی تنگ نظری، مذہبی وجدانات، قومیت اور نازک

مزاجی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔

آبادیات کی ابتدا :

سائنسی اعتبار سے آبادیات کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی کہ سماجیات کی لیکن دوسرے سماجی امور کی طرح آبادی کے تعلق سے بھی قدیم زمانے سے مفکّرین غور کرتے آئے ہیں کہ آبادی کے بڑھنے اور گھٹنے کے بڑے دُور رس نتیجے نکلتے ہیں۔ ان حالات پر غور کرتے ہوئے انھوں نے سماجی پالیسی سے متعلق پروگرام تجویز کیے ۔ ظاہر ہے ان مفکّرین کے خیالوں کا اثر بعد کی سائنسی تحقیقوں پر بہت گہرا پڑا ۔

اس مسئلے پر غور کرنے والے مفکّرین میں سب سے پیش پیش قدیم چین کے مذہبی پیشوا رہے ہیں جن میں کنفوشیس (Confucius) کا نام سب سے مشہور رہے ۔ اس مفکّر کا خیال تھا کہ کسی بھی علاقے کی آبادی میں اضافہ ہو تو اس کا اثر پیداوار پر پڑتا ہے جو معیارِ زندگی کو متاثر کرتا ہے ۔ اگر آبادی اور پیداوار میں تناسب باقی نہ رہے تو جھگڑے اور تنازعے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ کنفوشیس نے افراد اور زمین کے درمیان تناسب برقرار رکھنے اور زیادہ گنجان علاقوں سے کم گنجان علاقوں میں لوگوں کو منتقل ہونے کی تجویزیں پیش کی تھیں ۔ ظاہر ہے یہ کام گورنمنٹ ہی زیادہ مناسب طریقے پر انجام دے سکتی ہے ورنہ ایسے منفی (negative) عامل کام کریں گے جس کی وجہ سے آبادی میں خود بخود کمی ہو جائے گی ۔ ان منفی عناصر میں ناکافی غذا، متعدی امراض اور جنگ وغیرہ شامل ہیں ۔

یونانی مفکّروں نے بھی مسئلہ آبادی پر روشنی ڈالی ہے ۔ افلاطون اور ارسطو کا یہ خیال تھا کہ ریاست کے قائم ہونے کا اصل مقصد اچھی زندگی ہے اور اچھی زندگی کا تصوّر اسی وقت کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ عوام کی صحت اچھی ہو، افراد کی تعداد اتنی ہو کہ وہ معاشی طور پر خود مکتفی رہیں اور اپنا تحفّظ کر سکیں ۔ لہٰذا ان مفکّرین کا کہنا تھا کہ شادی ان عورتوں اور مردوں کی ہو سکتی ہے جن میں عمر، صحت، طبیعت کے لحاظ سے مناسبت ہو ۔ ان مفکّرین نے یہاں تک سختی روا رکھی تھی کہ وہ اولاد جو اس قاعدے کے خلاف ہو اگر ان کی اولاد میں نقص ظاہر ہو تو ان کو تلف کر دینا چاہیے ۔ وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ریاست کی آبادی میں تناسب سے زیادہ اضافہ نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ شہریوں کی تعداد کو ایک خاص حد سے بڑھنے نہ دیا جائے ۔ عام طور سے ریاستیں

ان امور پر توجہ نہیں دیتیں اور آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے پریشانیوں کا شکار رہتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ شہرت یافتہ مملکتیں وہی رہی ہیں جہاں کی آبادی محدود تھی۔ غرض ان مفکرین کے پاس تعداد اتنی اہم نہیں جتنی کہ آبادی کی قسم۔

ارسطو کے بعد جن یونانی مفکروں نے اس موضوع پر بحث کی ہے ان میں زینفون (xenophen) ہیرڈوٹس (Herodotus) اور تھوسی ڈی ڈس (Thucydides) ہیں جنھوں نے آبادی کے دباؤ کم کرنے کا ایک طریقہ نقلِ مقام تجویز کیا ہے۔ غرض یونانیوں کے پاس آبادی کے بڑھنے کی صورت میں لوگوں کو ملک سے باہر بھیجوانے اور آبادی کے گھٹنے کی صورت میں افراد کو داخل ہونے کی آزادی دینے کی ترغیبیں شامل ہیں لیکن چینی اور رومی فلسفیوں کے پاس اس قسم کا رُجحان نہیں ملتا کیونکہ ملک کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی کھپت ممکن ہے۔ ان مثالوں سے ہم ایسے سماجیاتی اصولوں کی طرف پلٹتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن ملکوں کی توجہ مملکت کی تشکیل پر لگی ہوتی ہے تو وہ آبادی میں اضافے کی ترغیب دیتے ہیں، رہبانیت کی مخالفت کرتے ہیں، بچوں کی پیدائش پر زور دیتے ہیں۔

عہدِ وسطیٰ کے مغربی مفکرین زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی قدروں میں اُلجھے رہے۔ انہیں سیاست اور سائنس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اس لیے متعدد مفکرین نے آبادی کے اضافے کی تائید کی اور انھوں نے بائبل کے اس فرمان ("be fruitful & multiply") کی پیروی کی۔ یہ ضرور ہے کہ ان مفکرین کو بھی قحط، جنگ اور متعدی بیماریوں کا خدشہ لگا رہا۔

اس موضوع پر بحث کے سلسلے میں دو کلیدی ناموں (Key names) کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جن کے خیالوں کا اثر آبادیات اور سماجیات پر بہت زیادہ پڑا۔ اس میں سے ایک چودھویں صدی کا مشہور مفکر ابنِ خلدون ہے اور دوسرا ابتدائی سترھویں صدی کا گی یووانی بوٹرو (Giovann Botero)۔ ابن خلدون کا شمار چوٹی کے مورّخ فلسفیوں اور سماجیات کے ماہروں میں ہوتا ہے جس نے آبادی کا متدائر نظریہ (Cyclical Theory) پیش کیا۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں زیادہ تر مفکر بیانی آبادیات (descriptive demography) سے زیادہ تجزیاتی آبادیات (analytical demography) پر توجہ دینے لگے اور یہیں سے آبادیات کے مطالعے میں سائنٹفک رُجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جان گرنٹ (John Grunt) کا ہے جسے ہمعصر حیاتی شُماریات

(vital statistics) کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ پیدائش، شادی اور موت کی شرح سے شماریاتی تناسب کا پتہ چلتا ہے۔ دیہی شرح موت کے مقابلے میں شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے مقابلے میں بچوں اور بوڑھوں کی شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی شرح موت زیادہ ہوتی ہے لیکن بعد میں دونوں جنسوں کا تناسب مساوی ہو جاتا ہے۔ گرنٹ وہ پہلا شماریات کا ماہر سمجھا جاتا ہے جس نے لندن کی آبادی کا سب سے پہلا زندگی کا جدول (life table) تیار کیا۔

آبادیات کی تاریخ میں سب سے زیادہ بجا طور پر شہرت حاصل کرنے والے انگریز پادری تھامس رابرٹ مالتھس (Thomas Robert Malthus) ہے جن کے مرہونِ منت معاشیات اور سماجیات ہیں۔ 1798ء میں مالتھس نے ایک کتاب "An Essay on the Principle of Population as it affects the future Improvement of Society." پر لکھی۔ یہ کتاب اتنی مشہور ہوئی کہ 1872ء تک اس کے سات ایڈیشن نکل گئے اور اس کتاب کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا، کیونکہ اس کتاب میں ایسے موضوع کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کی طرف سے غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ مالتھس نے اس مسئلے کے سب سے زیادہ ہولناک پہلا افلاس کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا باعث بڑھتی ہوئی شرح پیدائش ہے۔ اگر اس بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کو قابو میں رکھنے کی کوشش نہ کی جائے پھر اس کا نتیجہ ہر 25 ویں سال آبادی میں جیومیٹری کے تناسب سے اضافہ ہوگا یعنی 1، 2، 4، 8، 16، 32، 64، 128 اور 256 وغیرہ جب کہ غذائی پیداوار میں اضافہ، انسان کی بہتری کوششوں کے باوجود حسابی تناسب سے ہوگا یعنی 1، 2، 3، 4، 5، 6، 7، 8 اور 9 وغیرہ۔ مالتھس نے بڑھتی ہوئی آبادی کے بھیانک پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان دو امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔

1: مثبت تحدیدیں Positive Checks

2: منفی تحدیدیں Negative Checks

مثبت تحدیدیں عائد کرنا انسان کے قابو میں ہے۔ وہ اپنے حالات اور زمانے کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر ایسے اقدامات کر سکتا ہے جن کی بنا پر اس کا معیارِ زندگی اونچا ہو سکتا ہے اور وہ بہترین غذا، لباس، مکان، تعلیم اور تفریح کا انتظام کر سکتا ہے۔ ان مثبت تحدیدوں میں مالتھس کے نقطۂ نظر سے دیر سے شادی، بچوں کی تعداد اور معیارِ زندگی میں موزوں تناسب اور

بچوں کی محدود تعداد شامل ہیں۔ رہبانیت، جنسی تعلقات میں اخلاقی پابندی (moral restraint) بھی اونچے معیار کی نشان دہی کرتی ہیں۔

منفی تحدیدیں وہ ہیں جو کسی بھی نوع (species) پر اس کے مدتِ حیات کو کم کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں متعدی امراض، جنگ، قحط، سیلاب وغیرہ شامل ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔

مالتھس نے آبادی سے متعلق جن خیالوں کا اظہار کیا تھا اس کے بعد اس مسئلے پر بڑی نزاعی بحثیں شروع ہوئیں ان میں مارکس کا نام کافی اہم ہے جن کا خیال تھا کہ آبادی کے مسئلے کا تعلق پُرانے معاشی نظام کی برقراری اور خرابی سے ہے اور یہ مسئلہ سرمایہ دارانہ سماجوں سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے مارکس کا کہنا تھا کہ آبادی کا مسئلہ سوشلسٹ اسٹیٹ کے وجود میں آنے کے بعد دولت کی منصفانہ تقسیم سے بتدریج حل ہو جائے گا۔

اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے چند اعداد و شمار پر غور کرنا ضروری ہے جس۔ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آبادی کی شرح میں کس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اس اضافے سے معیارِ زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

1891	میں	235،9	ملین
1901	"	235،5	"
1911	"	249،0	"
1921	"	246،1	"
1931	"	275،5	"
1941	"	312،8	"
1951	"	359،0	"
1961	"	438،0	"
1971	"	547،0	"

دُنیا کی آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا دوسرا نمبر ہے۔ اگر پوری دُنیا میں ہر سال 103 ملین بچّے پیدا ہوتے ہیں تو اس میں سے 23 ملین بچے ہندوستانی ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہر پانچواں بچّہ ہندوستانی ہوتا ہے۔ پچھلے دو دہائیوں میں آبادی کی شرح فی ہزار 13،3 سے

بڑھ کر 6ء24 ہوگئی۔ زندگی کا تحفظ کرنے والی دواؤں کے استعمال اور اقل ترین معیار پر طبی امداد ملنے کی وجہ سے شرحِ اموات میں کمی ہوئی ہے جس سے آبادی کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستان میں اوسطِ عمر 52 سال ہے۔ ڈاکٹر منوہر اور ڈاکٹر جیونتی واگلے (Dr. Manohar & Dr. Jayawanti Wagle) کی تحقیق کے مطابق 022ء1 حاملہ عورتوں میں سے بائیس بچے مردہ پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہزار بچے زندہ رہتے ہیں جن میں سے 42 بچے ایک ہفتے کے اندر مرجاتے ہیں۔ 33 بچے ایک مہینے کے اندر ختم ہو جاتے ہیں اور مزید 65 بچے پانچویں اور 52 ہفتے کے اندر مرجاتے ہیں۔ 860 بچے جو بچ جاتے ہیں وہ اپنی پہلی سالگرہ مناتے ہیں۔ اس لحاظ سے تقریباً 25 فیصد بچے 5 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جتنے بھی لوگ مرتے ہیں ان میں سے 40 اور 50 فیصد کے درمیان بچے پانچ سال سے کم عمر میں مرجاتے ہیں۔ ان مرنے والے بچوں میں سے تقریباً 80 فیصد بچوں کی موت کا سبب ناکافی اور ناقص غذا ہے۔ اسی دردناک حقیقت کو دیکھتے ہوئے ماہر اطفال ڈاکٹروں کا کہنا ہے:

"Produce less or Perish."

ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہم کافی محتاط طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ افراد کے بغیر سماج کا وجود ممکن نہیں۔ چاہے افراد کی تعداد کم ہو یا زیادہ اس کا انحصار اس سماج کی امکانی قوت اور ترقی کے موقعوں (Potentialities & prospects) پر مبنی ہے، کیونکہ اگر آبادی میں اضافہ کا رجحان سنگین نتائج کا حامل ہے تو آبادی کی کمی بھی تشویشناک صورت کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے آبادی کی کمی بیشی دونوں سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آبادی کا تعلق حیاتیاتی عوامل سے ہے لیکن ان حیاتیاتی عوامل پر بہترین منصوبہ بندی قابو پا سکتی ہے۔

فرد اور سماج:

فرد اور سماج ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ نہ تو سماج کا تصوّر فرد کے بغیر ممکن ہے اور نہ فرد سماج کے بغیر اپنی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے فرد اور سماج کا دو رُخی تعلق ہوتا ہے اور اگر ہم فرد یا سماج کی اہمیت کو ایک دوسرے کے بغیر سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ صریحاً غلط ہوگا۔

فرد سماج میں رہ کر ہی ''انسان'' کہلا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان میں مخفی صلاحیتیں

ہوتی ہیں لیکن ان مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں سماج زبردست محرک ثابت ہوتا ہے۔ ہم اس تجربے کا خیال بھی نہیں کر سکتے کہ انسان کے بچوں کو سماجی ماحول سے جُدا کر کے ان کی جسمانی، ذہنی اور نفسی نشو و نما کا مشاہدہ کر سکیں۔ شعوری طور پر اس قسم کا تجربہ تو ممکن نہیں البتہ بعض حادثات اور واقعات ایسے ضرور پیش آئے ہیں جب کہ چند انسانی بچّوں کی نشو و نما غیر صحت مندانہ اور غیر انسانی ماحول میں ہوئی۔ اکثر سماجیات کی کتابوں میں ان بچّوں کی بکثرت مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکا تو سیاسی حادثے کا شکار ہوا۔ دوسرا کیس ان دو بچیوں کا ہے جو بھیڑیے کی کھوئی میں پائی گئیں اور تیسرا کیس اس لڑکی کا ہے جس کی پیدائش ناجائز تھی۔

1828ء میں شہر نیوریمبرگ (Nuremberg) میں ایک سترہ سال کے لڑکے کا پتہ چلا تھا جو بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا اور جس کی دماغی صلاحیت بچّوں کی طرح تھی۔ یہ لڑکا سیاسی حادثات کا شکار تھا۔ بچپن سے اسے ایک کسان کے گھر میں رکھا گیا تھا اور کسان کو تاکید کی گئی تھی کہ اس لڑکے کی پرورش ایک مقفّل کمرے میں کی جائے۔ اسی کمرے میں کاسپر ہاؤزر (Kasper Houser) کی زندگی کے سترہ سال بیت گئے۔ جب اسے رہا کیا گیا تو وہ صرف پانچ سال زندہ رہ سکا۔ مرنے کے بعد اس کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ اس کا دماغ سب نارمل (sub-normal) تھا۔ اس لحاظ سے کاسپر ہاؤزر کو سماجی تعلقات سے محروم کر کے اس کی جسمانی، نفسی اور ذہنی نشو و نما کو کچل دیا گیا۔

1920ء میں دو لڑکیوں املا اور کملا کا ایک بھیڑیے کی کھوئی میں پتہ چلا۔ املا کی عمر دو سال کی تھی اور کملا کی آٹھ سال۔ املا تو بہت جلد مر گئی مگر کملا نو سال زندہ رہی۔ جانوروں کے ساتھ ربط میں رہنے کی وجہ سے کملا کے طور طریقے بالکل غیر انسانی تھے۔ وہ چوپایوں کی طرح چلتی تھی بھیڑیوں کی طرح چیختی تھی اور انسانوں سے بالکل اسی طرح گھبراتی تھی جس طرح کہ جانور گھبراتے ہیں۔ اسے پکی ہوئی غذا کے مقابلے میں پھینکی ہوئی ہڈیاں اور کچّا گوشت زیادہ پسند تھا۔ غذا کو مُنہ تک پہنچانے کے لیے وہ ہاتھ کا استعمال نہیں کرتی تھی بلکہ جانوروں کی طرح مُنہ سے چاٹ لیتی تھی۔ لیکن جب اسے دوسرے انسانوں کے ساتھ رکھا گیا اور آہستہ آہستہ اسے انسانی سماج کے طور طریقوں سے واقف کرایا گیا تو کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے اور میل ملاپ کے طریقوں میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ مرنے سے پہلے کچھ بات بھی کرنے لگی تھی۔

1939ء میں سماجیات اور نفسیات کے ماہرین کو ایک پانچ سالہ لڑکی انا (Anna) کا

پتہ چلا جو ناجائز تعلقات کا نتیجہ تھی۔ جس کی بنا پر اس کی ماں نے ایک کمرے میں مقفل کر دیا تھا۔ لہٰذا اپنا کا ربط اس کی ماں سے رہا جو اسے دُودھ دینے کی غرض سے کمرے میں جاتی تھی۔ اس ظالمانہ سماجی علاحدگی کی بنا پر اپنا نہ تو بات کرنے کے قابل تھی اور نہ چل پھر سکتی تھی اور انسانوں سے بہت گھبراتی تھی۔

ان تینوں کیسوں سے ظاہر ہے کہ سماجی علاحدگی کا نتیجہ انسان کو ان تمام صلاحیتوں سے محروم کر دیتا ہے جو سماجی زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ جسمانی اعتبار سے آدمی کی اولاد ہوتے ہوئے بھی نہ تو بات چیت کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں، نہ اپنے جسم ڈھانکنے کا اُنھیں احساس ہوتا ہے، نہ کھانے پینے کا ڈھنگ اور نہ زندگی گزارنے کا کوئی انداز۔ نہ تو اُن کی صحیح جسمانی نشو ونما ممکن ہے اور نہ نفسی اور ذہنی۔ یہ سماجیت اور اکتساب کے طریق کا اثر ہے کہ ایک حیاتیاتی عضویہ کو سماجی عضویہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے جب کہ یہ فضا یا سماجی ماحول میسّر نہیں آتا تو وہ جانوروں کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ غرض ہماری بول چال، رہن سہن، میل جول کے طریقے، اندازِ فکر سب ہی سماجی بین عمل اور سماجی ربط کا نتیجہ ہیں۔ فرد بذاتِ خود نہ تو ابتدا ہے اور نہ انتہا بلکہ اس کی حیثیت سماج کی کڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا تعلّق سماج سے صرف اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ بیج کا زمین سے ہوتا ہے اور جب پودا اُگ جاتا ہے تو اسے دوسری طرف آسانی سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی نشو ونما کے لیے سماج کا وجود ضروری ہے اور وہ سماجی ورثہ اہم ہے جو برس ہا برس کے تجربوں کا نچوڑ ہوتا ہے اور وہ تمام افراد اور ذرائع جو قدم قدم پر شخصیت کو ڈھالنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

غرض فرد کی نشو ونما جس حد تک سماجی ورثے پر منحصر ہے اس سے ارسطو کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ "انسان سماجی حیوان ہے"۔ سماجی زندگی کی خواہش ایک جبلت ہے جو قدرت نے انسانی فطرت میں داخل کر دی ہے اور وہ شخص جو سماجی زندگی پسند نہ کرے یا جسے حاجت نہ ہو وہ دیو ہے یا دیوتا۔ انسان جب تک سماج میں نہیں رہتا اس وقت تک اس کی سرشت میں جو قوتیں (Forces) مضمر ہیں وہ پوری طرح ظہور میں نہیں آسکتیں اور نہ اس کی زندگی مکمّل ہو سکتی ہے، سماجی زندگی کی جبلی خواہش شہد کی مکھیوں اور غول میں رہنے والے جانوروں میں بھی ہوتی ہے مگر وہ سماجی حیوان اس لیے نہیں کہلا سکتے کہ ان میں " ہم جنسی شعور"

نہیں پایا جاتا جو سماجی زندگی کی بنیاد ہے۔ انسانی شخصیت Censciousnes of Kind کی تشکیل کے لیے سماج اور سماجی ورثے کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تعلق ایک رُخی ہوتا ہے بلکہ جس طرح افراد سماج سے اثر قبول کرتے ہیں اسی طرح افراد کا اندازِ فکر، ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے سماج کے رُخ کو پلٹا دیتے ہیں۔ افراد کے بغیر کوئی سماجی قوت کام نہیں کر سکتی۔ افراد کی دلچسپیاں، ان کے رُجحانات اور میلانات، ان کی اُمید و بیم سماج کے افعال اور مقاصد کا تعین کرتے ہیں۔

افراد اپنی مختلف صلاحیتوں کی بنا پر سماجی ورثے میں اضافہ کرتے ہیں مثلاً ادیب، ڈاکٹر، انجینئر، فن داں، سائنس داں، مصوّر، موسیقار غرض سب ہی اپنی نجی صلاحیتوں کی بنا پر سماجی زندگی کے معیار کو اُونچا کرتے ہیں اور آنے والی پیڑھیوں کے لیے ایسا سماجی ورثہ چھوڑ جاتے ہیں جس سے وہ مُستفید ہوتے ہوئے اس میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی افراد اور سماج میں تصادم بھی ہوتا ہے خصوصاً جب کہ انفرادیت کے حامی سماج کے مروّجہ طور طریقوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سماج کے معیاروں اور قدروں میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔

سماج کے نظریے: THEORIES OF SOCIETY

سماج کی ابتدا کے بارے میں جو نظریے پیش کیے گئے ہیں ان میں تین نظریے بہت اہم ہیں۔

1: نظریۂ معاہدہ Contract Theory
2: نظریۂ عضویت Organismic Theory
3: نظریۂ اجتماعی شعور Group-mind Theory

نظریۂ معاہدہ: COTRACT THEORY

نظریۂ معاہدہ سماج کی ابتدا کے بارے میں جو نظریۂ معاہدہ پیش کیا گیا ہے اس سلسلے میں تھامس ہابس (Thomas Hobbes 1588–1679)، جان لاک (John Lock 1632 — 1704) اور ژاں ژاک روسو (Jean Jacques Rousseau 1712–1778) کے خیالات غور طلب ہیں۔ ہابس کی مشہور تصنیف "LAVIATHAM" ہے جس کی لفظی معنی "بڑا بحری جہاز"

ہیں مگر ہابس کی مُراد ایک عظیم الشان ہستی ہے جو بہت سی ہستیوں کے ایک میں ملنے سے بنی ہو۔ یہ کتاب جس میں قانونِ فطرت اور سماجی معاہدے کے نظریے سے بحث کی گئی ہے 1651ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں ہابس نے انسانی سرشت کی عام خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ہابس کا کہنا ہے کہ فطرت نے تمام انسانوں کو ذہنی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے یکساں بنایا ہے۔ چونکہ سب کی استعداد کم و بیش برابر ہوتی ہے اس لیے سب کی خواہشیں اور انھیں پورا کرنے کی امید بھی برابر ہوتی ہے، لیکن انسان کی سرشت ایسی ہے کہ یہ مساوات ہی دائمی فساد کا باعث ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو دوسرے سے کمتر ماننے پر راضی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنی برتری تسلیم کرائے کیونکہ ہر ایک کو بڑا بننے کا شوق ہوتا ہے، لیکن ساری امیدوں اور آرزوؤں کا انحصار ہر شخص کی اپنی قوت پر ہوتا ہے اس لیے کوئی دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتا اور ہر وقت اس اندیشے میں رہتا ہے کہ اس کی جان جائے گی یا اس کی سب سے عزیز ملکیت چھن جائے گی۔ یہ گویا ایک مستقل جنگ کی حالت ہوتی ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ کیونکہ جنگ صرف اس حالت کو نہیں کہتے جب لڑائی ہو رہی ہو اصل میں جب تک یہ تعیّن نہ ہو جائے کہ امن قائم ہو گیا ہے اور اسے قایم رکھنے کا کوئی ذمّہ دار ہے تب تک جنگ کی حالت رہتی ہے اور اس حالت میں انسان علم، فن، آسایش اور زندگی کی ہر قابلِ قدر نعمت سے محروم رہتا ہے۔ یہ نعمتیں اس وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب انسان کو جان و مال کا خطرہ نہ ہو۔ جنگ کی حالت میں انسان کی زندگی بے مایہ، تلخ، بہیمانہ اور مختصر ہوتی ہے، لہٰذا ہر شخص اپنی قوتوں کو جس طرح سے چاہے اپنی جان کی حفاظت کے لیے استعمال کرتا ہے یعنی جو کچھ اس کے نزدیک جان کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے اسی کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس حالت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہابس نے "فطرت کے قانون" (Natural Right) کا اصول پیش کیا ہے۔ قانونِ فطرت وہ اصول یا عام قاعدہ ہے جسے عقل نے دریافت کیا اور جس کے مطابق انسان کے لیے ایسا رویہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے مہلک ہو یا جس میں اس کی حفاظت کے بہترین ذریعے نظر انداز کر دیے جائیں۔ انسان کی سرشت کی ایک نمایاں خصوصیت جسے ہابس نے پہلے ضمنی طور پر اور بعد میں بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے وہ خوف ہے۔ اگر خوف نہ ہوتا تو مستقل جنگ کی حالت انسان کو ناگوار ہی نہ ہوتی۔ وہ سماج اور سیاسی زندگی کی پابندیوں کو کسی طرح برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا اور

جذبات میں سے جو انسان کو امن کی طرف مائل کرتے ہیں ایک تو موت کا ڈر ہے، دوسرے ان چیزوں کی خواہش جو آسودہ زندگی کے لیے ضروری ہیں اور تیسرے اس کی یہ توقعات کہ یہ چیزیں محنت کے ذریعے حاصل ہو جائیں گی عقل امن و امان کی مناسب شرطیں پیش کرتی ہے جن کو ماننے کے لیے لوگ آمادہ کیے جاتے ہیں۔ یہی ہابس کے نزدیک سماجی معاہدے کی اصلیت ہے، لہٰذا انسان اپنی سلامتی کی نیت سے جو عہد یا وعدہ کرے اس کی پابندی لازمی ہے۔ چاہے اس کا سبب دباؤ اور خوف ہی کیوں نہ ہو؟ مثلاً اگر کوئی قیدی اپنی جان بچانے کے لیے روپیہ دینے کا یا اور کسی چیز کا وعدہ کرے تو یہ باقاعدہ معاہدہ ہے اور اسے پورا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہابس معاہدے کی تعریف بھی کرتا ہے۔ معاہدے کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے درمیان حقوق کا مبادلہ جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ آپس میں کسی بات کا عہد و پیمان کرلیں اور اس کی پابندی کریں۔

مختصر یہ کہ ہابس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ سماج اور ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے انسان فطری زندگی بسر کرتا تھا اور انسانی فطرت ایسی ہے کہ یہ فطری زندگی ایک دائمی جنگ بن جاتی ہے۔ اس سے نجات پانے کے لیے سماج اور ریاست قایم ہوتے ہیں اور فرماں روا مقرر کیا جاتا ہے۔ سماج کے تمام افراد اس معاہدے کو قبول کرتے اور پابند ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جان لاک نے ہابس کے جواب میں فطری زندگی کا نقشہ بالکل مختلف رنگ میں کھینچا ہے اور قانونِ فطرت کی جداگانہ طرز پر تعریف کی ہے۔ اس کے نزدیک فطری زندگی میں ہر طرح کا اطمینان، آسودگی اور آزادی میسّر تھی۔ قانونِ فطرت جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے ساتھ کریں لوگوں کو فساد سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں اس قانون کی قدر ہوتی ہے اور وہ صرف اس پر ہی عمل نہیں کرتا بلکہ دوسروں سے بھی جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس کی پیروی کراتا ہے۔ خالص سماجی نقطۂ نظر سے فطری زندگی کی دو خصوصیتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ انفرادی آزادی اور ملکیت کا حق جسے سب یکساں تسلیم کرتے ہیں۔ جب سماج قایم کیا جاتا ہے تو فطری زندگی کی یہی دو خصوصیتیں ہیں جن کا باقی رکھنا مقدم سمجھا جاتا ہے اور اجتماعی معاہدے کی شرائط طے کرتے وقت لوگوں کو انہی کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ سماج قایم کرنے کی ضرورت اس وجہ

سے نہیں ہوتی کہ لوگ فطری زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ آپس میں انصاف کرنے کا بہتر انتظام ہو جائے ہر شخص کا ضمیر اسے قانونِ فطرت کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا رہتا ہے لیکن ضمیر خواہ کتنا ہی بیدار ہو اس کے لیے اپنے معاملات میں خود انصاف کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ عام انسانی سرشت اس قدر نیک ہو جائے کہ دنیا میں مفسد باقی نہ رہیں اس وجہ سے فطری زندگی میں بھی ہر شخص اپنی جگہ پر منصف اور محافظِ امن کے فرائض انجام نہیں دے سکتا اور اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ عدل و انصاف کے قیام اور جان و مال کی حفاظت کے لیے کوئی مستقل انتظام ہو، اس لیے انسان اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لیے سماجی معاہدے میں داخل ہوتا ہے۔ حکومت اور قانون سازی کے ادارے قایم کرتا ہے۔ لاک نے اجتماعی معاہدے کی شرطیں بیان نہیں کی ہیں۔ اس وجہ سے کہ لاک کی نظر میں معاہدے اور اس کی شرطوں سے زیادہ اہم حاکموں کے درمیان حقوق اور اختیارات کی تقسیم ہے۔ ان کا کام جان، مال اور انفرادی آزادی کا تحفظ، عدالت کا انتظام اور ایسے قانون وضع کرنا ہے جن میں قانونِ فطرت ایک معین اور مسلّم شکل پا سکے۔ حاکم کی حیثیت ایک اعلا خادم کی سی ہے۔ اسے اپنے اقتدار کو رعایا کی دین سمجھ کر ان کا احسان ماننا چاہیے۔ حاکم ہر طرح سے پابند ہوتا ہے، رعایا کسی اعتبار سے پابند نہیں ہوتی اور اسے ہر وقت اس کا حق حاصل ہے کہ حاکم کو معزول کر دے۔ ہابس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر حکومت کے اقتدار میں کمی ہوئی یا رعایا نے اس کی باقاعدہ مخالفت شروع کر دی تو سماج اور ریاست دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ لاک کا عقیدہ تھا کہ حاکم کے بدلنے سے سماج منتشر نہیں ہو جاتا۔ بس ایک شخص یا چند اشخاص کی بجائے حکومت کے فرائض کی انجام دہی دوسرے لوگوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ حکومت کو قایم رکھنے کے لیے رعایا کا کسی قسم کے ایثار کا مطالبہ کرنا بے جا ہے۔ حاکم کو کسی حالت میں رعایا کی جان تو بڑی بات ہے اس کے مال پر تک کوئی اختیار نہیں ہو سکتا۔ افراد کی خواہشوں اور ان کے حقوق کا لحاظ کرنا ہر صورت میں اس کا فرض ہوتا ہے۔

اگر فطری زندگی کا وہ خاکہ جو لاک نے پیش کیا ہے صحیح مان لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان بغیر کسی خارجی دباؤ کے آسودگی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں اس لیے ان کی سرشت میں فطرت نے اس کی صلاحیت رکھی ہے اور قدرت نے ان قوانین کو جن پر ایسی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے پیدایش کے ساتھ ہی انسان کے ذہن میں ودیعت کر دی ہے تو پھر یہ سمجھ میں

نہیں آتا کہ سماجی معاہدے اور سیاسی ادارے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ لاک نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ راست روی کی عام خواہش کے باوجود آپس کے تعلقات میں ایسی پیچیدگیاں ہوجایا کرتی ہیں کہ عدالتی فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان خواہ دوسروں کے معاملات طے کرنے میں کتنا ہی موقع شناس اور راست باز ہو، ذاتی مفادات اور معاملات میں اسے اپنی غیر جانبداری پر اعتبار نہیں رہتا اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے معاملات میں کسی غیر شخص سے فیصلہ کرائے۔ لاک کا کہنا ہے کہ ہر سماج میں خواہ وہ مفسدوں سے کتنا ہی پاک ہو چند ایسے لوگ پیدا ہوجاتے ہیں جو عام معیار کی پابندی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ فطری دور میں بھی تھے۔ بجائے اس کے کہ ہر شخص اپنی قوتِ بازو سے اپنے حقوق کا تحفظ کرے اور دوسرے لوگوں کی بھی مدد کرے یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ سب مل کر ایک معاہدہ کرلیں جس سے سب کو یکساں فائدہ پہنچے۔

روسو نے علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی ہمت شکن اور دل کو بجھا دینے والی فضا سے اکتا کر "رجوع بہ فطرت" یعنی Return to the State of Nature کی صدا بلند کی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ انسان کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ روسو کی آرزو تھی کہ تہذیب ان امراض سے پاک کردی جائے جو اس میں پیدا ہوگئے ہیں۔ وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جنھوں نے انسان کو اور اس کی طبیعت کو بالکل جکڑ دیا ہے۔ اسی نیت سے اس نے پہلے تہذیب پر حملہ کیا۔ روسو اور اس کے مداحوں کے نزدیک فطری حالت کی طرف واپس جانے کے معنی یہ تھے کہ زندگی کے لیے نئے اور بہتر اصول اختیار کیے جائیں۔ انسانوں کی تقسیم خواص۔ اور عوام میں نہ کی جائے۔ شہریوں کی حیثیت سے سب کا مرتبہ برابر ہو اور سیاسی زندگی کے معنی شرفا اور درباریوں کی خوشامد اور حاکموں کی زیادتیوں کو برداشت کرنا نہ ہو بلکہ ایک اجتماعی جدوجہد میں شریک ہونا اور فرائضِ عامہ کو انجام دینا ہو۔ روسو کے خیال کے مطابق عقل سے بہت پہلے انسان کی رہبر دو جبلتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اپنی سلامتی اور بہبودی کی خواہش اور دوسری ہم جنس کو تکلیف میں دیکھنے سے نفرت۔ انسان جب وحشی جانوروں کی طرح رہتا تھا تو اس میں اپنی جان محفوظ رکھنے کی پوری صلاحیت تھی۔ وہ مضبوط، پھرتیلا، اور چالاک تھا مگر ہم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسے اپنی حفاظت کے لیے ہر وقت برسرِ پیکار رہنا پڑتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں نہ کوئی اخلاقی قدریں تھیں اور نہ معیّنہ فرائض اس لیے انسان نہ تو اچھا تھا اور نہ برا۔ اس میں نہ خرابیاں ہوسکتی تھیں، نہ خوبیاں۔ روسو کہتا ہے کہ ہمیں ہابس کی طرح یہ نہ طے کر لینا چاہیے کہ

نیکی کا کوئی تصور نہ ہونے کی وجہ سے انسان لازمی طور پر بُرا ہوگا۔ انسان آزاد تھا، بے پروا تھا، نہ دُکھ سہتا تھا، نہ دُکھ پہنچاتا تھا، اس کی ضرورتیں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے دونوں محدود تھے، لیکن وہ اس حالت پر قایم نہیں رہ سکتا تھا۔ انسان اور حیوان میں ایک بُنیادی فرق یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ جبلی خواہشوں کے علاوہ اس میں اپنا ارادہ ہوتا ہے۔ انفرادی اور مجموعی حیثیت سے ترقی کرنے اور درجۂ کمال تک پہنچنے کی استعداد۔ آب وہوا اور دیگر فطری محرک انسانوں کو اپنی قوتِ ایجاد کام میں لانے اور اپنی زندگی کے طریقے کو بہتر بنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ باہمی امداد کی قدر کو پہچاننے لگے ہیں۔

روسو کی سب سے مکمل تصنیف "سماجی معاہدہ" یا "Le Contract Social" ہے جو 1762ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں وہ کہتا ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے"۔ بہتیرے اپنے آپ کو دوسروں کا آقا سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل ان سے بڑھ کر غلام ہوتے ہیں۔ انسان کو صحیح قسم کی آزادی سماجی زندگی اور سچّے سیاسی اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ وہ ہوس اور غرض کا بندہ رہتا ہے۔ انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس سے تو انکار مشکل ہے لیکن یہ زنجیریں اس کی تنگ نظری، خود غرضی اور نفس پرستی نے بنائی ہیں۔ ان سے وہ رہا اس صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنے دل کو پاک کرے، راست بازی کو اپنا مسلک بنائے اور اس حقیقت کو جو اس کی نظروں سے کبھی چھپی نہیں رہتی اپنا رہبر بنائے، لیکن روسو کو ایسا معاہدہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے جس میں ایک فریق کا سراسر نقصان ہو اور دوسرے کا ہر طرح سے فائدہ۔ اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اپنی انسانیت اور تمام انسانی فرائض سے دست بردار ہوتا ہے۔ ایسی دست برداری انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ انسان سے ارادے کی تمام آزادی لے لینا اس کے افعال و اعمال کو اخلاقی معنی سے خالی کر دینا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسا معاہدہ جس میں ایک طرف مطلق اقتدار کا مطالبہ اور دوسری طرف کامل فرماں برداری کا وعدہ ہو مہمل اور ناقص ہے۔ اس طرح روسو یہ ثابت کر دیتا ہے کہ سیاسی اقدار صرف محکوموں کی رضامندی سے قایم ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار ہمیشہ ان ہی کی رضامندی پر ہوتا ہے۔ اس طرح روسو یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ریاست زبردستی قایم کی جائے تو اسے ریاست کہنا اور اس کے ماتحتوں کو شہری اور آزاد سمجھنا غلط ہے۔ لوگ غُلام بنتے اور بنائے جاتے ہیں۔ تلوار کی دلیل کو رد کرنے کی اکثر لوگوں میں ہمت نہیں ہوتی۔

روسو جس سماج کو سیاسی معاشرہ کہتا ہے اس کے لیے رضامندی کی شرط ضروری ہے اور یہ شرط اسی حالت میں پوری ہوسکتی ہے جب لوگ شعوری طور پر مناسب معاہدہ کریں۔ اس معاہدے کے مختلف ضابطے ہر جگہ ایک سے ہیں۔ ہر جگہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ غرض روسو سماج کے وجود کو نوعِ انسان کی سلامتی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔ فطری حالت سے گزر کر سماجی نظام میں داخل ہونے سے انسان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے عمل میں جبلت کی جگہ انصاف کا معیار کارفرما ہو جاتا ہے اور اس کے افعال میں وہ اخلاقی صفت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے موجود نہیں تھی۔ اس وقت جسمانی خواہش کے بجائے فرض کا احساس، ہوس کی جگہ حق کا احساس انسان عمل کا محرک بن جاتا ہے اور انسان جو اب تک اپنے سوا کسی کا خیال نہیں کرتا تھا خود کو دوسروں کے اصولوں کے مطابق چلنے پر مجبور پاتا ہے اور اسے نفس کا کہنا ماننے سے پہلے عقل کے مشورے پر چلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حالت میں وہ بہت سے اختیارات کھو بیٹھتا ہے جو اسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں لیکن ان کے بدلے میں اسے اتنے ہی فوائد بھی پہنچتے ہیں۔ اس کے قویٰ استعمال میں آتے ہیں۔ اس کے خیالات وسیع۔ اس کے احساسات لطیف ہو جاتے ہیں اور اسے بالآخر احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ایک انسان بن گیا ہے۔ لہٰذا فطری عنصر کا غالب رہنا انسان کی شان کے خلاف ہے، کیونکہ عقل اور اخلاق جو انسانی سیرت اور سرشت کے زیور ہیں ناموزوں فضا میں کبھی فروغ نہیں پا سکتے اور انسان کو نشو و نما کی وہ آزادی نہیں مل سکتی، اس کے حوصلوں میں بلند پروازی کا وہ شوق پیدا نہیں ہو سکتا جو روسو اور نوعِ انسانی کے دوستوں اور قدر دانوں کی نظر میں انسان کا خدا داد حق ہے۔ جس طرح فطرت ہر انسان کو اپنے اعضا پر پورا اختیار دیتی ہے اسی طرح "سماجی معاہدہ" اپنے تمام اراکین کو کامل اختیار دیتا ہے۔

سماجی معاہدہ سے متعلق ہابس، لاک اور روسو کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان میں بنیادی عنصر یہی ہے کہ سماج کے وجود میں آنے کی وجہ سے زندگی میں نظم و تربیت پیدا ہوتی ہے۔ سماج کی نشو و نما اور اس کی ترقی میں انسانی سعی کا بڑا دخل ہے۔ انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ انصاف، امن اور آزادی کے پیشِ نظر سماج کے ارکان کے درمیان مساوات اور ہم آہنگی کو برقرار رکھے۔

نظریۂ عضویت : THEORY OF ORGANISM

عضویت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ زمانۂ قدیم سے مغرب اور مشرق کے مفکرین اس نظریے

سے متعلق غور وخوض کرتے رہے ہیں جن میں افلاطون، ارسطو، روسو اور کوٹلیا بہت مشہور رہیں۔ ان تمام مفکرین نے ریاست کو ایک عضویہ قرار دیا تھا۔

(اسپنسر 1820ء۔ 1930ء) نے اس نظریۂ کا اطلاق وسیع پیمانے پر کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ریاست ہی نہیں بلکہ سماج ایک مثل جاندار شے کے ہے۔ جس طرح ایک حیاتیاتی عضویے کی بقاء کا دار ومدار تمام اعضاء کی موجودگی اور صحت پر مبنی ہے اسی طرح سماج کا وجود تمدن کے دوسرے اجزاء کے وجود کا مرہون منت ہے۔

اسپنسر اپنی بحث اس مفروضے سے شروع کرتا ہے کہ سماج ایک حیاتیاتی عضویہ ہے۔ اس مفروضے کی وہ منطقی توجیہہ بھی کرتا ہے جسے بعد کے مفکرین ایک سائنسی غلطی قرار دیتے ہیں۔

اسپنسر سماج اور حیاتیاتی عضویے میں جن مشابہتوں کا ذکر کرتا ہے وہ یہ ہیں؛

(1) انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں بتدریج نشو ونما ہوتا ہے۔

(2) جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویوں کے مختلف حصّوں میں پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔

(3) انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ دونوں کے اجزاء آپس میں ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔

(4) انسانی سماج اور حیاتیاتی عضویوں کے مختلف اجزاء آزادانہ طور پر اپنا فعل بھی انجام دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے مدد بھی لیتے ہیں۔

نظریۂ عضویت کی تشریح کرتے ہوتے اسپنسر صرف مشابہتوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان دونوں میں جو بدیہی فرق پایا جاتا ہے ان کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

(1) سماج کی کوئی مخصوص اور واضح شکل نہیں ہوتی۔

(2) سماج کی اکائیاں کوئی خاص مقام پر نہیں پائی جاتیں اور نہ وہ ایک دوسرے سے پیوست رہتی ہیں۔

(3) سماج کے اجزاء میں نسبتاً زیادہ حرکت پذیری پائی جاتی ہے۔

(4) سماج کا ہر فرد احساسات اور فراست کا ایک مرکز ہوتا ہے۔

اسپنسر کا خیال تھا کہ مشابہتوں سے زیادہ سماج اور حیاتیاتی عضویوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ بہت زیادہ نمایاں ہے اور اہم بھی۔ اس لحاظ سے سماج کو محض عضویہ ہی نہیں بلکہ

اگر ہم اسے فوق عضویہ Super - organism قرار دیں تو کوئی غیر معقول بات نہیں ہوگی۔

اسپنسر اپنے مفروضے کی مزید تشریح کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر سماج کا ایک طاقت بخشنے والا نظام ہوتا ہے، دوسرا تقسیمی نظام اور تیسرا تنظیمی نظام جس کی مشابہت ہم کو حیاتیاتی عضویوں میں تغذیہ، دورانِ خون اور عصبی نظام میں دکھائی دیتی ہے۔ سماج کے طاقت بخش نظام میں اسپنسر ان تمام پیداآور صنعتوں کو داخل کرتا ہے جو سماج کی زندگی کی بقا کے لیے مادی دولت پیدا کرتے ہیں۔ تقسیمی نظام میں حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذریعوں کا شمار کرتا ہے اور تنظیمی نظام میں گورنمنٹ کے تمام آرگن شامل ہیں جو تمام افراد کی جان اور مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ ملک میں امن و امان برقرار رکھتے اور افراد کو استحصال سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اسپنسر کا خیال تھا کہ حیاتیاتی ارتقار کا اطلاق سماجی مظاہر پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ حیاتیاتی عضویوں کی طرح تمام سماجی اداروں (خاندان، مذہب، تعلیم، معاش، سیاست اور تفریح) کا ارتقار بہت ہی سادہ طریقے سے ہوا لیکن بعد میں پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ یعنی دوسرے لفظوں میں تمام سماجی ادارے آسان سے مشکل، سادہ سے پیچیدہ اور متجانس (homogenous) سے غیر متجانس (hetrogenous) ہوتے گئے۔

جس طرح حیاتیاتی عضویے زندگی کے مختلف دور سے گزرتے ہیں جیسے پیدائش، بلوغ، بڑھاپا اور موت اسی طرح سماجی ادارے بھی اسی قانونِ فطرت کے تابع ہوتے ہیں۔ اس رجحان کی شاہد اسپنگلر (Spengler) کی وہ مشہور تصنیف ہے جو 1918ء میں "Decline of the West" کے نام سے شایع ہوئی۔ اسپنگلر ایک جرمن سماجی مورخ تھا جس نے ایسی آٹھ ترقی یافتہ تہذیبوں کی مثالیں دی ہیں جو ایک حیاتیاتی عضویے کی طرح پیدائش، نشوونما، ترقی، عروج، انتشار اور زوال کے مختلف دوروں سے گزرنے کے بعد فنا ہوگئیں۔

سماجیات کے وہ مفکر جو کونت (Comte) اور اسپنسر کے پیرو تھے انھوں نے اُن خیالوں کی بڑے شد و مد سے تائید کی جن کی وجہ سے بعد میں بہت اعتراضات ہوئے۔

حیاتیاتی عضویوں کی مدت معین ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے سے یہ خیال چلا آرہا ہے کہ انسان کا دورِ حیات "ستر سال" "Three score and ten" ہے۔ انسان کی جسمانی نشوونما اور دماغی پختگی کا بھی تعین ہوچکا ہے، جس طرح سے کہ اس کی اوسط عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف سماجی عضویہ کے دورِ حیات کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی نہ تو اوسط عمر ہوتی ہے اور نہ انتہائی عمر۔ مثال کے طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں تعلیمی ادارے کی اوسط عمر یہ ہوگی اور اس کی انتہائی عمر یہ ہو سکتی ہے۔ برس ہا برس سے روئے زمین پر قدیم ترین تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ یہی حال مختلف مذاہب کا ہے، مختلف حکومتوں کا ہے، مختلف علوم و فنون کا ہے۔ اس لحاظ سے سماجی اداروں کی مدّتِ حیات غیر معیّن ہوتی ہے۔

حیاتیاتی عضویوں میں خلیے (cells) مستقل طور پر ایک جگہ رہتے ہیں جب کہ سماج کے افراد مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک سوسائٹی کو چھوڑ کر دوسری سوسائٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ جس طرح جسم میں تمام اعضاء کے لیے ایک مخصوص جگہ مقرر ہے سماجی اداروں میں اس طرح جگہ کا تعین ممکن نہیں۔ سماج کے مختلف ادارے مختلف جگہوں پر اپنا فعل انجام دیتے رہتے ہیں۔

حیاتیاتی عضویوں میں دماغ تمام جسم کی اکائیوں کو کنٹرول کرتا ہے لہٰذا عصبی نظام پر اگر کوئی بُرا اثر پڑتا ہے تو جسمانی ڈھانچہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کا مکمّل کنٹرول کرنے والا سماج میں کوئی ادارہ نہیں ہوتا جس کے زوال کی وجہ سے تمام سماجی ادارے مفلوج ہو جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ حکومتوں کا تختہ اُلٹ جاتا ہے لیکن اس کی وجہ سے تمام سماجی ادارے ختم نہیں ہوتے۔ وہ متاثر ضرور ہوتے ہیں لیکن پھر بھی اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔

اجتماعی شعور کا نظریہ: GROUP MIND THEORY

اس نظریے کا سہرا امائیل درکائم (Emile Durkheim 1858-1917) کے سر ہے جو ایک فرانسیسی ماہرِ سماجیات تھا۔

درکائم کا نظریۂ اجتماعی نیابت (Collective Representation) انفرادی نفسیات کی نفی کرتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے یہ خیال ہی غلط ہے کہ فرد سوچتا ہے۔ دراصل فرد نہیں سوچتا بلکہ اس کے خیالات، رائیں، عقیدے، قدریں سب کچھ سماجی گروہ کی پیداوار ہیں جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس طرح درکائم کا سسٹم سماجی جبریت (Social determinism) کا سسٹم ہے جس میں فرد کی تخلیق کے لیے بالکل یا تھوڑی سی گنجائش ہے:

"Durkheim's system is a system of social

determinism that leaves little or no place for the creativity of the human individual."

اس خیال کا اظہار بڑے عمدہ طریقے سے درکائم نے اپنے مشہور مقالے

"The Elementory forms of the Religious life."

میں کیا ہے۔ مذہب کو درکائم انفرادی نہیں بلکہ سماجی پیداوار قرار دیتا ہے۔ مذہب کی اساس گروہ کے تجربے ہیں اور مذہبی تصورات سماجی قدروں کی علامتوں سے زیادہ نہیں۔ اس لحاظ سے مذہب کا سب سے اہم فعل سماجی ہم آہنگی یا سماجی وحدت کی تخلیق اور بقا ہے۔ افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے والی قوت کے اعتبار سے انسانی سماج میں مذہب کا بہت اہم رول رہا ہے۔ اس طرح درکائم کے خیالات جو مذہب کی ابتدا اور نشو ونما سے متعلق ہیں وہ بالکلیہ سماجیاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مذہبی زندگی ہماری سماجی زندگی کی غمازی کرتی ہے۔ وہ ہماری سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے جس میں انتہائی ناخوشگوار پہلو بھی اُبھرتے ہیں۔ سماجی روایتیں انسانی فکر اور سوچ بچار کے دائرہ کو محدود کر دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے درکائم کے نظریۂ اجتماعی نیابت میں انفرادی حیاتیاتی عوامل اور انفرادی نفسیاتی عوامل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

سماجیات میں درکائم کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا نظریۂ "اجتماعی نیابت" ہے۔ درکائم کا کہنا کہ گروہی فکر کے مابین عمل سے علامتیں بنتی ہیں اور ان اجتماعی علامتوں میں بڑی زبردست قوت ہوتی ہے، کیونکہ ان کی تخلیق اور نشو ونما اجتماعی فکر کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ملک کا جھنڈا وہاں کے سیاسی رُجحانوں اور مسلکوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ مقدس تحریریں اور علامتیں مذہبی رُجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔ سوماؤں سے جو معجزاتی قوتیں وابستہ کی جاتی ہیں وہ اجتماعی غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس اجتماعی نیابت میں زبردست سماجی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ اتحاد اور تعاون کے جذبوں کو اُبھارتی، تصادم اور نزاعوں کو روکتی ہیں۔ غرض درکائم کا نظریۂ اجتماعی نیابت سماجی قدروں کی نشان دہی کرتا ہے۔ سماجی قدریں اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ کہ انفرادی عمل کا اس لیے افراد انھیں غیر ارادی طور پر قبول کرتے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ درکائم کا نظریہ اجتماعی نیابت دراصل فرد کے ان خیالوں اور رجحانوں کو ظاہر کرتا ہے جس کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو سماجی نمونوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ خیالات کا وہ مجموعہ، افعال و اعمال کے وہ نمونے، رُجحانات

اور قدریں جو کسی گروہ میں قابل قبول ہوں اور جنہیں گروہ کی تائید حاصل ہو انہیں فرد اس طرح اپناتا ہے کہ وہ اس کی سماجی زندگی کا جُز بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے شخصیت کی تشکیل میں سماجی دباؤ کا زبردست رول ہوتا ہے۔ غرض درکائم دوسرے یورپی ماہر سماجیات کی طرح اس خیال پر زور دیتا ہے کہ

"The individual soul is but a microscopic reflection at the social world."

یعنی "انفرادی روح سماجی دُنیا کا ایک خوردبینی عکس ہے"۔

درکائم کے اس نظریے پر انفرادی نفسیات کے حامی مفکرین نے کافی تنقید کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نظریے میں یہ خامی پائی جاتی ہے کہ وہ انفرادی قوتوں اور انفرادی فکر کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا حالانکہ انفرادی فکر بالکل جُدا گانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ انفرادی فکر اور سوچ بچار کی نوعیت پانی کے قطروں یا بادلوں کی طرح نہیں ہوتی جو ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔

اگر افراد واقعی سماجی دُنیا کا عکس ہیں تو ہم سب کو ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہونا چاہیے اور موجودہ نسل کو گزشتہ نسلوں کی ہوبہو عکاسی کرنی چاہیے۔ ان میں کوئی تبدیلی، کوئی ترقی نظر نہیں آنی چاہیے۔ اس لحاظ سے ہمارے سماجی ادارے بالکل آدی باسیوں کی طرح ہونا چاہیے۔ چونکہ افراد میں انفرادی طور پر سوچنے، سمجھنے، محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لیے سماجی اداروں کا تقابلی مطالعہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وقفہ وقفہ سے ان اداروں کی ساخت اور فعلیت میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

میک آئیور (Mac Iver) نے اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے "like" یعنی مثل اور "Cemmen" یعنی مشترک کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ "مثل" کی حیثیت خانگی یا انفرادی ہوتی ہے جب کہ مشترک کی نوعیت اجتماعی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دو طالب علم ایک ہی مشترک یا Common کتاب کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ان کے خیالات ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہوں گے نہ کہ Common۔ اس طرح افراد چونکہ سماج میں رہتے ہیں اس لیے اُن کے خیالات، رُجحانات اور احساسات ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہو سکتے ہیں لیکن سب کے خیالات اور سوچ بچار کے ڈھنگ کا بالکلیۃً مماثل اور یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرستِ کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا

1- Bierstedt, R: "The Social Order." MC.Graw Hill N.Y. p. 1963
2- Gillin & Gillin. "Cultural Sociology."
3- Bogardus, E.S. "The Development of Social Thought." Longmans N.Y. 1955.
4- Ellwood, C.A: "A History of Social Philosophy." Prontice Hall. N.Y. 1950.
5- Ma lindale, D. "The Nature & Types of Sociological Theory." Houghten. U.S.A. 1960.
6- Sharma, R.N: "Introductory Sociology." Educational publishers. Meerut. 1977.
7- Yowg, "Sociology." p. 235-252.

چوتھا باب

توارث اور ماحول

(HEREDITY AND ENVIRONMENT)

توارث: HEREDITY

انسان کو ایک عفویہ یا organism سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ عفویہ سے زندگی کا سوال وابستہ ہے لیکن، زندگی کی ماہئیت کے بارے میں آج تک تفشی بخش جواب حیاتیات کے ماہر بھی نہ دے سکے۔ بہرحال انسان کے علاوہ دوسری موجودات میں بھی زندگی پائی جاتی ہے، لیکن ہمارے لیے جو سوال اہم ہے وہ یہ کہ انسانی عفویے پر اثر انداز ہونے والے عوامل کون سے ہیں؟

انسان دو عنصروں کا مرکب ہے: پہلا حیاتیاتی یعنی biological اور دوسرا سماجی یعنی social۔ حیاتیاتی اثرات توارث کا نتیجہ ہیں تو سماجی اثرات ماحول کا مظہر۔ توارث دراصل ان مخصوص خصوصیتوں کی منتقلی کا نام ہے جو والدین کے ذریعے بچوں میں منتقل ہوتی ہیں:

"Heredity is the transmission of Certain characteristics from parents to offspring."

بالفاظ دیگر توارث میں وہ تمام جسمانی، ذہنی اور نفسی خصوصیتیں شامل ہیں جو والدین کی طرف سے بچوں میں منتقل ہوتی ہیں مثلاً رنگ و روپ، قد و قامت، ناک نقشہ، ڈیل ڈول، وضع قطع، بالوں اور آنکھوں کا رنگ اور ساخت۔ ان تمام جسمانی خصوصیتوں کے علاوہ

تخلیقی صلاحیتیں، ذہانت اور فراست، افتادِ طبع، بربادی و رمتانت، کم ظرفی اور اوچھاپن وغیرہ کو بھی بڑی حد تک توارث کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ غرض توارث کی وجہ سے جسمانی ساخت، دماغی صلاحیتوں اور نفسی رُجحانوں کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔

توارث کے موضوع پر سائنسی بُنیادوں پر کافی کام ہو چکا ہے جس میں سب سے پیش پیش نام جوہان مینڈل (Johann Mendel) اور سر فرانسس گالٹن کا ہے۔ ان دونوں مفکرین کا تعلق ارتقار کے دبستان (Evolutionist School) سے تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں آسٹریلیا کے ایک پادری جوہان مینڈل نے جس کا مشغلہ باغبانی تھا اپنے باغ میں مٹر کے پودوں پر کچھ تجربے کیے اور یہ بات ثابت کی کہ موروثی خصوصیتیں والدین سے اولاد میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور ان کا نہ صرف تجربہ خانے میں مُشاہدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ ایک حد تک انھیں ضروریات کے مطابق کنٹرول میں رکھ کر ان میں تنظیم اور باقاعدگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مینڈل نے ایسے پودے یا جانور کو جس میں دو مختلف عنصر پائے جاتے ہیں مخلوط النسل یا دوغلا (Hybrid) کہا ہے۔ مینڈل کے تجربوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ مخلوط النسل پودوں کا اختلاط کیا جائے تو ان سے حاصل ہونے والی اولاد کا تناسب 1 : 3 ہوگا یعنی ہر چار بچوں میں سے تین لانبے یا بلند قامت ہوں گے اور ایک پست قد۔

مینڈل نے یہ بھی وضاحت کی کہ بعض خصوصیتیں ایک یا دو پیڑھی کے بعد بھی ظاہر ہو سکتی ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ غالب خصوصیتوں کی موجودگی میں مغلوب خصوصیتیں چھپی رہتی ہیں، لیکن غالب خصوصیتیں کسی طرح ہٹ جائیں تو مغلوب خصوصیتیں فوراً ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کئی اور خصوصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی مخالف خصوصیتوں کو ظاہر ہونے نہیں دیتیں۔ سیاہ رنگ بھورے یا ہلکے رنگ پر غالب آجاتا ہے۔ سیدھے اور گھنگھریالے بالوں میں گھنگھریالے بال غالب آجاتے ہیں۔

مینڈل کے ان تجربوں سے ایسے کئی سربستہ راز انکشاف ہوئے جو برس ہا برس تک سائنس دانوں کی ذہنی کشمکش کا باعث رہ چکے تھے۔

مینڈل کے ہم عصر سر فرانسس گالٹن (Sir Francis Galton) نے شماریات (Statistics) کے ذریعے توارث کے کلیوں کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پہلے کلیے جدی توریث یعنی Law of ancestral inheritance کے لحاظ سے ہر فرد اپنے

والدین سے نصف خصوصیتیں حاصل کرتا ہے اور $\frac{1}{4}$ حصّہ اپنے دادا دادی اور نانا نانی سے اور $\frac{1}{8}$ حصّہ پڑدادا اور پڑدادی، پڑنانا اور پڑنانی سے یعنی تیسری پیڑھی پہنچتے پہنچتے $\frac{1}{16}$ حصّہ اولاد تک پہنچتا ہے۔ یہ کلیہ ابھی تک ایک مسلمہ امر ہے۔

گالٹن کے دوسرے کلیے Law of filial regression کے لحاظ سے اولاد اپنے والدین کے بین بین ہوتی ہے یعنی اگر والدین میں سے ایک بلند قامت ہو اور دوسرے کا قد میانہ تو اولاد کا قد اوسط ہوگا۔ اسی طرح والدین میں سے ایک کالا اور دوسرا گورا ہو تو اولاد سانولی یا گندمی ہوگی۔ گالٹن کا یہ کلیہ سائنسی بحث و مباحثہ کا مرکز بنا رہا کیونکہ یہ کلیہ مینڈل کے کلیہ غالبیت Law of dominance کی نفی کرتا ہے۔

مینڈل اور گالٹن کی تحقیقوں کے بعد اور ایک اہم دریافت ہوئی جس نے علم توارث میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کیونڈش تجربہ خانہ میں ڈاکٹر فرانسس کرک (Francis Crik) اور جیمس واٹسن (James Watson) نے ایک ایسے سالمے (molecule) کی ساخت واضح کی جس کا تعلق راست طور پر وراثت اور جینس (genes) سے ہے۔ جین وراثتی خصوصیتوں کو منتقل کرنے والی اکائیاں ہوتی ہیں جو دراصل کیمیائی نوعیت کے ترشے ہوتے ہیں جن کو (Nucleic Acids) کہا جاتا ہے۔ ان کا تفصیلی نام De-oxy-ribo-Nuclaic Acids ہے لیکن اس کا مخفف 'D.N.A' ہے جو حیاتیات یا biology میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اس D.N.A کے پیچیدہ سالموں میں molecules میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے۔ D.N.A کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کس طرح اپنے والدین سے جسمانی خصوصیتیں حاصل کرتے ہیں اور کس طرح اپنے پرکھوں سے حاصل کیا ہوا یہ سرمایہ اپنے بچوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ہمارے اندر پائے جانے والے یہ عناصر پیڑھی بہ پیڑھی بغیر کسی نمایاں تبدیلی کے کیوں اور کیسے اپنی اصلی حالت میں باقی رہتے ہیں اور کیوں کر دفعتاً بعض ایسی خصوصیتیں اُبھر آتی ہیں جو کسی جد اعلا میں پائی گئی تھیں مگر ایک عرصے تک چھپی رہیں اور کس طرح نئی خصوصیتیں یک بیک پیدا ہو جاتی ہیں جو اس خاندان کے افراد میں پہلے نہیں دیکھی گئی تھیں؟ غرض D.N.A کے مطالعے سے ساختی فرق، دماغی اور ذہنی صلاحیتوں، کمزوریوں اور بیماریوں کے متعلق اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ کس حد تک توریثی قانون کی پابند ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے ایسے اسباب ہیں جو کسی بھی جاندار کو اپنے پرکھوں

(ancestor) کا ہمشکل بنا دیتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں خلیے میں کون سی ایسی ساخت پائی جاتی ہے جو وراثتی خصوصیتوں کی منتقلی میں مدد دیتی ہے۔

ہر ایک عضویہ (جاندار) کا جسم ایک یا کئی ساختی اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کو خلیے (cells) کہا جاتا ہے۔ ادنا ترین عضویوں میں ایک ہی خلیہ زندگی کے تمام افعال انجام دیتا ہے لیکن زیادہ ارتقا یافتہ پیچیدہ اجسام میں یہ خلیے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اتنے ہی مختلف شکل و صورت، وضع قطع کے ہوتے ہیں جتنے کام انھیں انجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو دل کے عضلات اور بازوں کے عضلات بنانے والے خلیے یکساں ہوتے ہیں اور نہ ہی جلد کی بیرونی پرت اور زبان کی بیرونی پرت کے خلیوں میں کوئی مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ہر خلیہ وہی فعل انجام دیتا ہے جس کے لیے وہ مختص ہے۔

عضویے ایک خلوی (unicellular) ہوں یا کثیر خلوی (multicellular) یہ سب مکمل طور پر نمو پاکر پختگی کو پہنچنے کے بعد بالکل اپنے والدین کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ کا بچہ سنپولا اور مرغی کا بچہ چوزہ ہوتا ہے۔ نہ تو کدو کی بیل پر انگور کے رسیلے خوشے لٹکتے نظر آتے ہیں اور نہ آم کے درخت پر انار۔ ان ہی روزمرہ کے مشاہدوں سے اس مقولے کی بارہا تصدیق ہوتی ہے کہ ہر عضویہ اپنی ہی نوع کو جنم دیتا ہے یعنی like begets like.

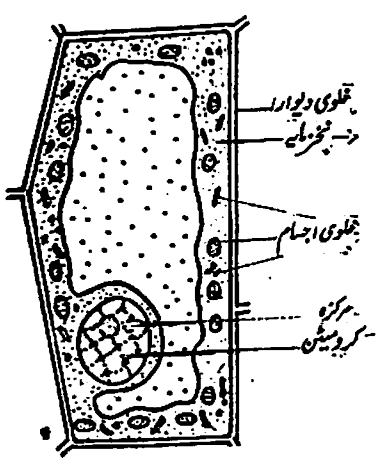

ایک تمثیلی خلیہ

اگر کسی خلیے کی ساخت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ دو اہم اجزا پر مشتمل ہوتا ہے یعنی اس کا ایک بڑا حصّہ شفاف، نیم سیال، دانہ دار مادہ سے پُر ہوتا ہے جس کو نخزمایہ یا Protoplasm کہتے ہیں۔ اس نخزمایہ کے اندر تیرتا ہوا ایک کروی جسم ہوتا ہے جو مرکزہ یا nucleus کہلاتا ہے۔ یہ مرکزہ خلیے کے تمام افعال کا ذمّہ دار ہے۔

خورد بینی مشاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرکزہ کے اندر چھوٹے چھوٹے نازک دھاگہ نما اجسام پائے جاتے ہیں جن کو لونی اجسام یا Chromosomes کہا جاتا ہے۔ یہ لونی اجسام مختلف وضع کے ہوتے ہیں۔ کچھ سلاخ نما، گول اور کچھ یو (U) اور وی (V) کی طرح نظر آتے ہیں۔ ہر لونی جسم دُہرے پیچ کھائے دھاگہ جیسا ہوتا ہے اور اس میں چھوٹے چھوٹے بہت سے منکے پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے منکوں کو جین (genes) کہتے ہیں۔ یہ جین وہ اکائیاں ہیں جو موروثی خصوصیتوں کو والدین سے اولاد میں منتقل کرتی ہیں۔

غرض توارث کے قانون کئی سال سے سائنسی تحقیق اور بحث و مباحث کا موضوع بن چکے ہیں اور یہ امر اب تک سائنسی حلقوں میں قابلِ قبول ہے کہ جین (genes) کے ذریعے موروثی خصوصیتیں ایک پیڑی سے دوسری پیڑی میں منتقل ہوتی ہیں۔ ہر جسمانی اور ذہنی خصوصیت کی ایک علاحدہ جین ہوتی ہے جو بچّوں میں اپنے والدین کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔ اگر والدین کی طرف سے یکساں جین ملیں تو بچے وہی مخصوص خصوصیت کے حامل ہوں گے اور اگر دونوں کے جین مختلف ہوں تو جو بھی غالب جین یعنی dominant gene ہو گی اسی کا اثر بچّے قبول کریں گے مثال کے طور پر اگر والدین گورے ہوں اور دونوں کی جین بھی اسی قسم کی ہو تو لازماً بچّے گورے ہوں گے۔ اس کے برخلاف اگر ایک کی جین میں کالے رنگ کا عنصر زیادہ ہو اور دوسرے میں گورے رنگ کا تو ان دونوں میں جو بھی جین غالب ہو گی اس کا اثر بچّے کے رنگ پر پڑے گا۔ اگر گورے ماں باپ کا بچّہ کالا ہو تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ دونوں میں سے کسی ایک کی جین میں کالے رنگ کا عنصر ہے جو پچھلی پیڑی سے چلا آرہا ہے جو بچّے کے تعیّن کے وقت نمایاں ہو گئی یا غالب آگئی۔ بعض وقت ایک جین پیڑیوں سے چلی آتی ہے مگر پوشیدہ رہتی ہے، ظاہر نہیں ہوتی اور پھر کسی خاص پیڑی میں اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ منتقلی کے وقت کسی جین میں یکایک تبدیلی آجاتی ہے جسے mutation کہا جاتا ہے۔

کئی ماہرین نے مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی جسمانی ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی سائنسی تحقیقیں کی ہیں تاکہ توارث کے اثرات کا پتہ چلا سکیں ان تحقیقوں سے یہ ثابت ہوا کہ توارث کی وجہ سے جسمانی خصوصیتوں کا تعین ہوتا ہے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس نکتے کی بھی وضاحت کی ہے کہ جسمانی خصوصیتوں کے تعین میں ماحول کے اثرات اور صحت مند غذا کا بہت زیادہ دخل ہے۔ فرانز بواس (Franz Boas) نے اس بیان کی توثیق کے لیے ایسی کئی مثالیں دی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جاپانی اور یہودی جو امریکہ میں بس گئے تھے ان کی جسمانی خصوصیتیں آب و ہوا، غذا کی تبدیلی اور خصوصاً متوازن غذا (balanced diet) کے استعمال سے کافی متاثر ہوئی ہیں۔ ان کے رنگ روپ، قد و قامت، جسمانی ساخت میں کافی فرق پیدا ہو گیا۔

بہر حال بنی نوع انسان میں جو مشابہتیں اور فرق پایا جاتا ہے ان کی وضاحت مختلف طور سے کی جاتی ہے۔ کچھ ماہرین اسے توارث کا نتیجہ قرار دیتے ہیں تو کچھ اسے ماحول کی اثر پذیری قرار دیتے ہیں اور کچھ ماہرین ان دونوں کے بین بین خیالات پیش کرتے ہیں کہ توارث اور ماحول دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور محض کسی ایک کی برتری کو تسلیم کرنا درست نہیں۔

توارث اور ماحول کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں اور پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ عام معلوماتی ادب میں غلط تصورات کے پھیلنے کی وجہ سے کئی لوگ غیر پسندیدہ افعال کو توارث کا اثر سمجھنے لگے اور ایک دوسرے پر اس طرح کیچڑ اچھالتے رہے کہ "اس قسم کا فعل فلاں شخص سے ممکن ہے کیونکہ اس خاندان کا خون ہی ایسا ہے"۔ غرض جرم چاہے معمر لوگوں سے سرزد ہو یا کمسنوں سے اسے بھی توارث کا اثر دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پاگل پن، غربت اور بے روزگاری کا سبب بھی توارث ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔

جس طرح ماہرین کے ایک گروہ تخلیقی صلاحیتوں اور ذہانت کے علاوہ بیوقوفی، کاہلی اور نادانی کو توارث کا سبب قرار دیتا ہے اسی طرح دوسرا گروہ جسمانی زندگی میں ماحول کے اثرات کی فوقیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ ماحول کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

"Environment may be defined as all the external conditions & circumstances that surround an organism at a given time."

یعنی "ماحول سے مُراد وہ تمام خارجی حالات اور واقعات ہیں جو ایک مخصوص وقت میں عضویہ پر چھائے رہتے ہیں"۔

جان ڈبلو واٹسن (John W. Watson) کو کرداری نفسیات (behavioris-tic psychology) کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق نجی فطرت یا Orginal nature پر صحیح یا خوشگوار ماحول قابو پا سکتا ہے جس کی بنا پر افراد پسندیدہ طریقوں کو اپنا کر سماج کے بہترین اور مفید تر رُکن بن سکتے ہیں۔ بہرحال ہر ماہر اپنے نقطۂ نظر کی صداقت کو واضح کرنا چاہتا ہے، حالانکہ صحیح رائے وہ ہے جو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ لہٰذا توارث اور ماحول دونوں اپنی جگہ اہم ہیں اور افراد کی شخصیت کی تشکیل میں کسی ایک کی فوقیت کو تسلیم کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کرنا سائنسی اصول کے مغائر ہے۔

ماحول میں دو طرح سے تخصیص ممکن ہے۔ پہلا داخلی ماحول یعنی internal en-vironment اور دوسرا خارجی ماحول یعنی external environment۔

داخلی ماحول ایک سیّال مادہ یعنی تخم مایہ protoplasm اور مرکزہ Nucleus پر منحصر ہے اور ان ہی دو عوامل پر خلیے کی حیاتیاتی اور تولیدی زندگی کا دارومدار ہے۔

خارجی ماحول دو عنصروں کا مُرکّب ہے (1) جُغرافیائی اثرات (geographic forces) اور (2) سماجی۔ تمدّنی اثرات (socio-cultural forces) جُغرافیائی اثرات زمین، پانی، آب و ہوا، محل و وقوع اور قدرتی ذریعوں کی قلّت اور کثرت کے تابع ہیں اور تمدّنی اثرات سماجی بین عمل کے مختلف طریقوں پر مرتّب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سوچ بچار کے طریقے، طرزِ برتاؤ کے نمونے اور اعتقادات متاثر ہوتے ہیں۔

داخلی ماحول میں تخم مایہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور خصوصاً تخم مایہ کا وہ حصّہ جس میں مرکزہ مدّتوں (embedded) رہتا ہے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ متواتر تقسیم ہونا اور نئے مماثل خلیے بناتا رہتا ہے۔ اس صورت میں یہ پتہ لگانا مُشکل ہے کہ ان خلیوں کی پیدائش میں کتنا حصّہ مرکزہ کا ہے اور کتنا تخم مایہ کا۔ توریثی خصوصیتیں تمام کی تمام مرکزہ میں مرکوز رہتی ہیں۔ بظاہر ماحول صرف تخم مایہ کو متاثر کرتا ہے اور مرکزہ ماحول کے اثرات بہت کم قبول کرتا ہے۔ عضویوں کی ایک بڑی تعداد جنسی اختلاط سے حاصل ہوتی ہے اور صنفی تقسیم سے عضویہ وجود میں آتا ہے۔

خارجی ماحول میں جُغرافیائی اثرات سے عضویے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ حرارت، روشنی اور بعض کیمیائی عنصر راست طور پر زندگی کے افعال پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر الٹراوائلٹ شُعاعیں جسم میں وٹامن ڈی کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ اکثر ایسے ممالک میں جہاں سورج کی روشنی کافی نہیں ہوتی یا موسم کی غیر موزونیت کی وجہ سے بچوں کو زیادہ تر بند کمروں میں رکھنا پڑتا ہے تو وہ مرض ریکٹس (Rickets) میں مُبتلا ہو جاتے ہیں جو وٹامن ڈی کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔

معدنی نمک (Mineral Salts) بھی جسم کی بناوٹ اور تندرستی کے لیے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماحول عضویوں پر کس طرح اثرانداز ہوتا ہے۔ روشنی سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ حرارت سے جسم کے اندر کیمیائی تعملات کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مختلف معدنی اشیاء نخزمایہ کی بناوٹ میں حصّہ لیتے ہیں۔ ان کی کمی بیشی سے جسم کے بہت سے افعال متاثر ہوتے ہیں۔ پیدائش اور بالیدگی بہت سارے متنوع کیمیائی تعملات کی ایک کڑی ہے۔ اور اس کڑی میں کسی موقع پر بھی خلل آجائے تو معاملہ بہت کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

بعض صورتوں میں ماحول راست طور پر جاندار میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا بلکہ صرف ایک ہیج یا Stimulus کا کام کرتا ہے۔

پہلوان اور کھلاڑی کی جسمانی صلاحتیں بلکلیہ ماحول کی مرہون منّت ہیں۔ جتنا زیادہ ان صلاحیتوں کا استعمال کیا جائے گا اور مشق جاری رہے گی یہ صلاحتیں پروان چڑھتی ہیں۔ یوگیوں کے بیشمار کمالات قلب اور تنفسی نظام کی تربیت کا نتیجہ ہیں جو عضلات کو قابو میں رکھنے کا نتیجہ ہیں۔

نفسی اور ذہنی صلاحتیں بھی ماحول سے کافی اثر قبول کرتی ہیں۔ اسی لیے والدین کی یہ خواہش رہتی ہے کہ ان کے بچوں کو بہترین تعلیمی ماحول ملے تاکہ ان کی مخفی صلاحتیں اجاگر ہو سکیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماحول صرف ایک ہیج کا کام انجام دیتا ہے اور توارث کے ذریعے جو صلاحتیں افراد میں منتقل ہوتی ہیں ان کو بڑی حد تک اجاگر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین اور سازگار ماحول اور وقفے ملنے کے باوجود بھی غلط ہوگا کہ افراد ریاضی کے ماہر، بہترین سائنس داں، مصوّر، موسیقار بن جائیں کیونکہ اس میں ماحول سے زیادہ نجی

صلاحیتوں کا دخل ہوتا ہے۔ بہرحال توارث اور ماحول دونوں افراد کی جسمانی، نفسی اور ذہنی نشوونما پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی برتری کو تسلیم کرنا اور دوسرے کو نظرانداز کر دینا بڑی بھاری غلطی ہے۔ مثال کے طور پر اس حقیقت کو سمجھیے کہ جسمانی، نفسی اور ذہنی جو بیماریاں ماں باپ سے اولاد میں منتقل ہوتی ہیں وہ بڑی تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ متعدی امراض جو خورد بینی عضویوں کے ذریعے پھیلتے ہیں ان پر قابو پانا بہ نسبت موروثی امراض کے زیادہ آسان ہے۔ متعدی امراض پر دواؤں اور عمل جراحی کے ذریعے قابو پایا جاسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں یا چند مہینوں میں ان سے چھٹکارا پانا ممکن ہے لیکن موروثی امراض کا سد باب کرنے کے لیے انسان کو بڑی محتاط زندگی گزارنی پڑتی ہے کیونکہ جب ایک دفعہ یہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر ان سے چھٹکارا ممکن نہیں تو بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے موروثی مرضوں کے لیے حفظِ ماتقدم پر مبنی تدابیر اختیار کرنا مناسب رہتا ہے کیونکہ مرض ظاہر ہونے کے بعد پھر اس پر قابو پانا فنِ طب اور انسانی طاقت سے باہر ہو جاتا ہے۔

توارث کے اثرات جسمانی، نفسی اور ذہنی صحت پر دیکھنے کے بعد انسانی افعال و اعمال پر اکتسابی عوامل (acquired factors) کے اثرات اور ان کے نتیجوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سماجیات اور نفسیات کے ماہروں نے ایسے کئی توام بچوں (twins) کے افعال و اعمال کا سائنسی نقطۂ نظر سے مشاہدہ کیا ہے جو جسمانی ساخت میں نوے فیصد ایک دوسرے سے مشابہ ہونے کے باوجود اپنی پسند اور ناپسند، سمجھ اور ناسمجھ کا اظہار مختلف طریقے سے کرتے ہیں۔ ایک ہنس مکھ ہے تو دوسرا چڑچڑا، ایک ضدی تو دوسرا آسانی سے بات مان لینے والا، ایک ملنسار تو دوسرا آدم بیزار، ایک تجسسی تو دوسرا ڈل (dull)۔ اس امر سے صاف ظاہر ہے کہ ایک ہی ماحول سے دو بچے مختلف اثرات قبول کرتے ہیں۔ فری مین (Freeman) نے غریب گھرانوں کے شکاگو کے فاسٹر ہوم (foster homes) میں رہنے والے چار سو سے اوپر بچوں کی ذہانت کے امتحان سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ بہتر ماحول ملنے کی وجہ سے عام طور پر غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے بچوں میں کافی صحت مندانہ تغیر پایا گیا بہ نسبت ان بچوں کے جن کا تعلق متوسط اور امیر گھرانے سے تھا۔ فاسٹر ہوم میں داخل ہونے کے وقت ان بچوں کی ذہانت کا ٹسٹ کیا گیا تھا اور سات سال کے

وقفے کے بعد ان کی ذہنی نشو ونما کی رفتار کو دیکھنے کے لیے پھر یہ ٹسٹ کیا گیا تو زیادہ تر غریب گھرانے کے بچوں کی حد تک اس ٹسٹ کے نتیجے بہت ہی ہمت افزا رہے جس کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہتر گھریلو ماحول، صحت مندانہ فضا، تعلیمی موقعوں کی فراہمی غذا کا مناسب انتظام، محلے کے خوشگوار اثرات، موزوں ہم عمروں سے ربط، طبی امداد کی سہولتیں، آگے بڑھنے کے لیے موزوں محرکات اور موقعے ایسے اکتسابی عوامل ہیں جو افراد کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔

فہرست کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا۔

1- Dressler, D. "Sociology - the Study of Human Inte-
raction." Knopf N.Y. 1975. P.153.

2- Young, K.: "Sociology - A Study of Society & Culture."
American Book Company. N.Y. 1942. P.340-341.

3- Dressler. P.153.

4- Young. P. 356.

5- Winchester, A-M: "Heredity & Genetics." College
Outline Series. Barnes & Noble- INC. 1962.

6- Robert. M.S. Willian, N.D. "Exploring Behaviour &
Experience. Prentice Hall. 1971.

7- Porter & SKalko: "Heredity & Society."

8- Burlinganore, L.L. "Heredity & Social Problems."

پانچواں باب

سماجی سسٹم؛ سماجی تفریق اور سماجی درجہ بندی

SOCIAL SYSTEM: SOCIAL DIFFERENTIATIONS. SOCIAL STRATIFICATION.

سماج میں زندگی گزارنے سے پتہ چلتا ہے کہ افراد اور گروہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مرد عورت سے، جوان بوڑھے سے، ڈاکٹر انجینئر سے، ارلیٹک ٹیچر سے، وکیل مرشد سے، آجر مزدور سے، اسی طرح خاندان، معاشی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور تفریحی گروہ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ یہ فرق محض انفرادی خصوصیتوں کی وجہ سے نمایاں نہیں ہوتا بلکہ مختلف سماجی نوعیتوں کی وجہ سے بھی ان میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

جب بھی سماجیات کے ماہر سماجی تفریق یا Social differentiation سے بحث کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر یہی سماجی مظہر ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کے سماجیاتی تجزیے (Sociological analysis) میں یہی بنیادی سوال پیش نظر رہتا ہے کہ افراد کی درجہ بندی (Stratification) میں سماجی ٹیپالوجی (Social typology) کا عنصر کس طرح کارفرما رہتا ہے؟

سماجی تفریق کے دوش بہ دوش چلنے والا ایک اور سماجی مظہر بھی ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہے جُداگانہ کام کی نوعیت جس سے سماج میں افراد کے درجے یا حیثیت کا تعیّن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر اور ایک مزدور کے کام کی نوعیت سے یہ بدیہی فرق ہمارے سامنے آتا ہے کہ کام کی نوعیت مختلف ہونے کی وجہ سے سماج میں ایک کا درجہ بہت اونچا ہوتا ہے تو دوسرے کا بہت کم۔ لیکن سماجی تفریق کی نوعیت اس وقت بدل

جاتی ہے جب ہم ایک ہی پیشے سے تعلق رکھنے والے دو افراد کے سماجی پوزیشن پر غور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو ڈاکٹر اور دو انجینئر۔ چنانچہ جب ہم کسی فرد کے سماجی ٹائپ کو جان لیتے ہیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ حیثیت کے اعتبار سے سماجی میزان (social scale) میں کس نکتے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہی وہ سماجی مظہر ہے جسے سماجیات کے ماہر سماجی درجہ (social stratification) اور مختلف درجوں (ranks) کو پرت یا (strata) کہتے ہیں۔

"Social stratification is a system of ranking individuals in different levels, or strata, of prestige or status."

یعنی "سماجی درجہ بندی ایسا سسٹم ہے جس میں قدر و منزلت یا حیثیت کی مختلف سطحوں یا پرتوں میں افراد کو درجے دیے جاتے ہیں۔"

اس بیان کی وضاحت دو لڑکوں کے طرزِ عمل سے باآسانی ہو سکتی ہے جن میں سے ایک ڈاکٹر کا لڑکا ہے اور دوسرا مزدور کا۔ طرزِ عمل کا فرق ظاہر ہے محض اچھی غذا اور عمدہ کپڑوں کے استعمال کی وجہ ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ سماجیت کی مختلف ایجنسیوں کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کھیل میں اگر کسی موقع پر تکرار ہو جائے تو مزدور کا لڑکا جس آسانی سے فحش کلامی پر اتر آتا ہے اس کی توقع، ڈاکٹر کے لڑکے سے نہیں کی جا سکتی۔ موسیقی اور ڈرائنگ سے جو لگاؤ ڈاکٹر کے لڑکے کو ہو سکتا ہے وہ مزدور کے لڑکے کے لیے بے معنی ہو سکتا ہے۔ غرض ان دو لڑکوں کے طرزِ عمل اور مشاغل میں جو فرق نظر آتا ہے اس کا تعین سماجی درجہ بندی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس اکتسابی طریق (learning process) کی وجہ سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ سماج میں افراد کی حیثیتوں کا اندازہ لگانے کے لیے مختلف پیمانے سامنے آتے ہیں۔ سماجیت کے اسی اکتسابی طریق کی وجہ سے ذات یا سلف (Self) کا واضح تصور ذہن میں آتا ہے۔ افراد اسی درجاتی میزان (ranking scale) میں اپنی نشاندہی کرنا سیکھتے ہیں۔

اکتسابی طریق یا (learning process) ہر کمیونٹی میں پایا جاتا ہے یہ ضرور ہے کہ ہر کمیونٹی میں درجہ بندی کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں یعنی شہری علاقوں میں سماجی

درجہ بندی کی نوعیت دیہی اور قبائلی علاقوں سے جُداگانہ ہوتی ہے۔ چھوٹے علاقوں میں درجہ بندی کی نوعیت واضح ہوتی ہے جب کہ بڑے شہروں میں درجہ بندی کی نوعیت پیچیدہ اور بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ مضافات میں سماجی درجہ بندی میں بہت زیادہ متجانسبت (hemogenity) پائی جاتی ہے اور شہروں میں غیر متجانسبت (hetrogenity) بہت واضح رہتی ہے۔

سماجی درجہ بندی کی وہ نوعیت جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اسے نہ صرف سماجیات کے ماہر طبقہ (class) کہتے ہیں بلکہ عام بول چال میں بھی یہی اصطلاح رائج ہے۔ ڈاکٹر اور مزدور کے لڑکوں کے افعال و اعمال کا فرق ان کے خاندانی پس منظر کی غمازی کرتا ہے اور اس طبقہ واری نوعیت کو ظاہر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے والدین سے ہوتا ہے۔ امریکی سماج میں سماجی درجہ بندی میں نسل یعنی Race اور ethnicity کو بہت زیادہ دخل ہے۔ یہ اصطلاح امریکی ماہرین سماجیت کی ایجاد ہے جس کا اطلاق امریکی سماج پر ہوتا ہے۔ اس سے مُراد وہ تمدنی خاصے یعنی cultural traits ہیں جو امریکہ میں بسنے والے اپنی جائے پیدائش سے ساتھ لائے اور انہیں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں سماجی درجہ بندی کی واضح مثال ذات پات کا نظام یعنی Caste system ہے۔

غرض ماہرین سماجیات مختلف نقطۂ نظر سے سماجی درجہ بندی کا مطلب سمجھتے اور اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تمام ماہرین اس خیال پر متفق ہیں کہ سماجی درجہ بندی کی نوعیت آفاقی یعنی universal ہوتی ہے کیونکہ تمام سماجوں میں برتر اور کمتر حیثیت کا فرق پایا جاتا ہے۔

درجہ بندی کی اصطلاح ارضیات یعنی geology سے کی گئی ہے جس طرح چٹانیں ایک دوسرے پر رکھی ہوتی ہیں اور کسی چٹان کی ماہیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی تہہ کو کھودنا پڑتا ہے اسی طرح سماجی درجہ بندی کو جاننے کے لیے بھی ان تمام عنصروں کی تحقیق کرنی پڑتی ہے جس کی بنا پر افراد میں تفریق ممکن ہے۔

تمام انسانی سماجوں میں درجہ بندی پائی جاتی ہے، لیکن درجہ بندی کے معیارات جُداگانہ ہوتے ہیں، چنانچہ کسی سماج میں عمر سماجی برتری اور کمتری کا تعین کرتی ہے تو کسی سماج میں جسمانی طاقت اور کسی سماج میں علم او رفن کی بنا پر امتیاز کیا جاتا ہے۔ جہاں

تک عمر کا تعلق ہے روایتی چین یعنی Traditional China اس کی کلاسیکی مثال ہے۔ کئی قبائلی سماجوں میں پیرشاہی یا Gerenlocracy کا رواج ہے یعنی کسی فرد کی اونچی حیثیت کا معیار پیرانہ سالی ہے۔ ان سماجوں میں جہاں بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انسان کو بہت زیادہ کشمکش کرنی پڑتی ہے وہاں جسمانی طاقت کی بناء پر سماجی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں علم، ڈگری، فنی مہارت اور دولت سماجی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سماجی رول: SOCIAL ROLES

سماج میں افراد کے درجے اور حیثیت کا جس طرح تعین ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے سماجی رول کے مفہوم اور سماجی رول کی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ سماجیات کے ماہروں نے سماجی رول کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"A social role Consists of behavior an individual has learned to enact- in responding to the expectations of parti- cular collectivities of people in specific social Situation".

یعنی "سماجی رول افراد کے ان برتاؤ کے ان اکتسابی طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے جو وہ مخصوص سماجی حالتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخصوص افراد کی توقعات کو پورا کرنا چاہتا ہے"۔

مثال کے طور پر کسی ہوٹل میں کھانے کے بعد ہمیشہ بل مرد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور سے مرد سے بل ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے جو شائستگی کی علامت ہے۔ اسی طرح لکچر کے ختم ہونے کے بعد جب طالب علم اپنے شک و شبہات دور کرنے کے لیے سوالات کرتے ہیں تو لکچرار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے نفس مضمون کی تشریح اطمینان بخش طور پر کرے گا جو اس کے پیشے کا نمایاں جزو ہے۔ اس طرح مخصوص سماجی حالتوں میں فرد کا جو مخصوص برتاؤ ہوتا ہے اسے " role expectancy" کہا جاتا ہے اور توقعات کے مطابق فرد کا جو عمل ہوتا ہے وہ "role performance"

یا role ful filment کہلاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فرد جس طریقے سے اپنا رول انجام دیتا ہے وہ توقعات کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور توقعات کے خلاف بھی۔

غرض سماجی رول برتاؤ کے وہ نمونے ہوتے ہیں جنھیں تمدن کی تفسیر کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہر فرد ہر مخصوص سماجی حالت میں باہمی توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ توقعات ہوتے ہیں جسے ہم اپنے افعال و اعمال کے لیے "موزوں"، "مناسب" اور "صحیح" سمجھتے ہیں۔ یہی برتاؤ کے وہ اقدار ہوتے ہیں جس کا خیال سماجی رول کے انجام دیتے وقت کرنا پڑتا ہے۔ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامے "As you Libe it" میں کہا تھا:

"All the worlds a stage, And all the men & women mearly players, they have their exists & their entrances, And one man in his time plays many parts."

یعنی "دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر تمام مرد اور عورت محض اپنی اداکاری دکھاتے آتے جاتے رہتے ہیں اور ایک آدمی اپنی زندگی میں کئی کام کرتا ہے۔"

شیکسپیر نے جو اشارہ "کئی کام" کی طرف کیا ہے اسی خیال کو سماجیات کے ماہر اس طرح ادا کرتے ہیں:

"Each individual in a society enacts many roles."

یعنی "سماج میں ہر فرد کئی رول ادا کرتا ہے۔"

جب ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتے ہیں تو ہمارا رول بیٹی یا بیٹے کا ہوتا ہے، کالج میں طالب علم کا، دکان پر خریدار کا، سڑک پر رہرو کا، جلسے میں سامعین کا، دفتر میں آفیسر یا ماتحت کا۔ غرض ہر فرد اپنی عمر، جنس، خاندانی پس منظر، پیشہ، مذہب، مقام اور شہر کے لحاظ سے مختلف رول ادا کرتا ہے۔ کسی کے ساتھ اس کے قریبی مراسم ہوتے ہیں تو کسی کے ساتھ رسمی اور کسی کے ساتھ موقتی۔ غرض ہر سماجی رول کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ چند سماجی رول اکثر و بیشتر افراد انجام دیتے ہیں مثلاً بطور شہری، رائے دہندہ، ادیب،

منتظم اور وزیر وغیرہ۔ چند سماجی رول صرف ایک فرد ہی انجام دیتا ہے مثلاً پریذیڈنٹ، سپریم کورٹ کا جج، گورنر، میئر وغیرہ۔ چند سماجی رول رضاکارانہ طور پر انجام دیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے فرد چاہے تو وہ رول انجام دے سکتا ہے یا چھوڑ سکتا ہے مثلاً کسی ایسوسیشن کی رکنیت وغیرہ۔ بعض رول لازمی ہوتے ہیں اور پیدائش کے بعد ہر فرد کو اپنی جنس کے مطابق یہ رول انجام دینا پڑتا ہے جیسے عورت اور مرد کی جنس پر مبنی مختلف افعال کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا۔

رول کی انجام دہی میں عمر کا زبردست حصہ ہوتا ہے، چنانچہ جب بچہ چاکلیٹ کے لیے ضد کرتا ہے تو یہ عمر کا تقاضہ ہوتا ہے لیکن ایک عمر رسیدہ فرد سے اس فعل کی توقع نہیں کی جاتی، یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر افراد اپنی عمر کے لحاظ سے ایسے رول انجام دیتے ہیں جو موزوں سمجھے جاتے ہیں۔

بہرحال چاہے افراد عمر کے لحاظ سے رول ادا کریں، چاہے رضاکارانہ یا غیر رضاکارانہ طور پر ہمیشہ توقعات یا expectations رول کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ رول کی نوعیت کے ساتھ توقعات کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن ہم کسی حالت میں بھی سماج کی توقعات اور سماجی قدروں کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔

ریفرنس گروہ (حوالہ گروہ): REFERENCE GROUP

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد کس طرح اپنے رول کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنے رول کا اندازہ دوسروں کے ردِّعمل سے ہوتا ہے یعنی وہ اپنے طرزِ عمل کی پسندیدگی یا غیر پسندیدگی کا اندازہ سماج کے دوسرے افراد کے فیصلوں کی منطق سے لگاتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں وہ افراد جن کے ردِّعمل سے ہم اپنے اچھے یا بُرے برتاؤ کا اندازہ لگاتے ہیں انھیں ریفرنس گروہ کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر، انجینیئر، آرکیٹکٹ یا ایڈوکیٹ اپنا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرکے یہ اندازہ قایم کرتا ہے کہ وہ کس حد تک ان سے آگے یا پیچھے ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ اہم ہے کہ افراد اپنی ناکامی کی توجیہہ مختلف طریقوں سے کرتے ہیں اور ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جو ان کی ناکامی کا جواز ہوں۔ مثال کے طور پر ایک وکیل دوسرے

وکیل کے مقابلے میں اپنی معاشی تنگی کا حل اس فلسفیانہ ناویل میں ڈھونڈھتا ہے کہ وہ اصول پرست ہے، اخلاقی قدروں کا حامی ہے جب کہ اس کے ساتھی بے ایمانی سے روپیہ کمانے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ ریفرنس گروہ سے وابستگی لچک دار ہوتی ہے اور عام طور پر لوگ ایسے افراد کا حوالہ دیتے ہیں جو خاص موقعوں پر ان کے مقصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

رول کامپلیکس: ROLE CEMPLEX

اس تصور کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے:

"*The entire array of an individual's social roles may be Considered his role Complex.*"

یعنی سماجی رول کے مجموعہ کو رول کامپلیکس کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کوئی فرد مرد ہے، بالغ ہے، غیر شادی شدہ ہے، بیٹا ہے، سپاہی ہے، مصوّر ہے، دولت مند خاندان کا فرد ہے، کمیونسٹ ہے۔ ان تمام سماجی رول کے مجموعے کو رول کامپلیکس کہا جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فرد تمام رول ایک ہی وقت میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ پسندیدہ۔ وہ صرف وہی رول ادا کرتا ہے جو موقع کے لحاظ سے موزوں ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ایک سپاہی گھر لوٹتا ہے تو اس کا رول ایک بیٹے، باپ اور شوہر کا ہوتا ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے جنگی حربوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جب وہ مندر یا مسجد جاتا ہے تو وہ اپنے عقائد کے لحاظ سے پوجا پاٹھ یا عبادت میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح موقع محل کے لحاظ سے رول کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ فرد پرانے رول کی بجائے نئے رول اختیار کرتا ہے۔ عمر کے مختلف دور میں مختلف رول کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کے رول میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ ایک غیر ماہر کاریگر جب فنی مہارت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے پچھلے اور حالیہ رول میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

رول اور شخصیت کی تشکیل :

فرد کا سماج میں جو درجہ ہوتا ہے اور اس کے مطابق وہ جو رول ادا کرتا ہے اس سے شخصیت کی نشوونما پر بڑے دُور رس اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ جب متعلقہ رول کو انجام دینے کا کسی فرد میں احساس اجاگر ہوتا ہے تو اس کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب رول کا میلیکس کی وجہ سے فرد کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے، انجینئر ہے، ٹینس کا کھلاڑی ہے تو ذات کے تصور "Self - Concept" کی نشوونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے فرد اپنے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ "میں فلاں ہوں اور فلاں کام انجام دینے کے لیے میں اس جگہ پر ہوں"۔

مختلف سماجی رول کے تقاضوں کی بنا پر افراد ایسے ہی افعال انجام دیتے ہیں جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ ان افعال کو انجام دینے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ان نمونوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

تصادمی رول : CONFLICTING ROLE

مثال کے ذریعے اس تصوّر کی وضاحت بخوبی ہوتی ہے، کسی ہوٹل کے خزانچی کے پاس جب اس کا دوست جاکر یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ پورا بل ادا کر دے تو وہ بڑی کشمکش میں پڑجاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوست کے ساتھ مروّت برت کر کم پیسوں کا بل بنائے یا جس جگہ پر وہ بیٹھا ہوا ہے اس رول کی انجام دہی کے لیے صحیح بل بنائے۔ یہ وہ حالت ہے جب کہ رول میں تصادم پیدا ہوتا ہے۔

رول میں جو تصادم پیدا ہوتا ہے اس کے ماخذ کئی ہیں۔ اس کی سب سے اہم وجہ تو یہ ہوگی کہ فرد جو رول انجام دے رہا ہے وہ اس کی طبیعت کے مطابق ہوتے ہوئے بھی حالات کے لحاظ سے الجھنوں کا شکار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایسی بے شمار شادی شدہ عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی پسند سے مختلف پیشوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں، لیکن وہ ذہنی طور پر اتنی کشمکش کا شکار رہتی ہیں کہ وہ نہ تو بالکلیہ پیشوں کی انجام دہی کے

لیے اپنے آپ کو وقف کر سکتی ہیں اور نہ گھریلو ذمہ داریوں کی تکمیل پوری طور پر اطمینان بخش طریقے پر انجام دے سکتی ہیں۔

رول میں تصادم پیدا ہونے کی دوسری وجہ عدم دلچسپی ہوتی ہے۔ جب کسی شخص کو اس کی مرضی کے مطابق رول تفویض نہیں کیا جاتا تو بڑی بدمزگی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے جو رول اسے ادا کرنا پڑتا ہے وہ بحسن و خوبی انجام نہیں پا سکتا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فرد جو رول انجام دے رہا ہے اس رول کے متعلق اس کے ذہن میں کوئی واضح اور صاف تصور موجود نہ ہو جس کی وجہ سے وہ صاف طور پر اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اسے کس قسم کا رول انجام دینا پڑے گا۔ مثال کے طور پر اکثر افراد اس نزاعی بحث میں اُلجھے رہتے ہیں کہ عورتوں کو ملازمت کرنی چاہیے یا نہیں؟ اس قسم کا رُجحان نہ صرف سماج کے کسی ایک مخصوص طبقے میں پایا جاتا ہے بلکہ ایک ہی خاندان میں مختلف افراد کے مختلف خیالات ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال سے اس بیان کی مزید وضاحت ممکن ہے۔ بعض افراد اس بات کی رشدت سے مخالفت کرتے ہیں کہ پڑھنے والے بچوں کی تمام تر توجہ پڑھائی لکھائی پر صرف ہونی چاہیے اور ان سے گھر کا بالکل کام نہیں لینا چاہیے جب کہ بعض افراد پڑھائی اور گھریلو معروفیت کے بہترین امتزاج کو پسند کرتے ہیں۔ قبائلی سماج میں عمر کے مختلف گریڈ ہوتے ہیں اور جیسے ہی فرد ایک گریڈ سے دوسرے گریڈ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی معروفیت کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

رول میں تصادم کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فرد دو یا دو سے زیادہ متضاد سماجی حیثیتوں کو انجام دینے کی فکر میں اس طرح اُلجھ جائے کہ اس کا عمل رول کے عدم تسلسل کی صورت میں ظاہر ہو۔

زندگی میں اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ فرد جو ایک خاص رول ادا کرتا چلا آتا ہے اس کو حالات سے مجبور ہو کر نیا رول انجام دینا پڑتا ہے۔ اس نئے رول سے وابستہ توقعات کو پورا کرنے کی کوشش میں وہ لگا ہی رہتا ہے کہ اس پر اور کچھ ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس پر role strain پڑنے لگتا ہے۔ رول کے اس دباؤ اور بار کی وجہ سے فرد کو بڑے تکلیف دہ تجربوں سے گزرتے ہوئے مطابقت پیدا کرنی پڑتی ہے۔

رول میں تصادم پیدا ہونے کی وجہ سے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

سماجیات کے ماہروں نے تین تنبیوں کی طرف بطور خاص اشارہ کیا ہے:

1 : جرم اور نو عمروں کی خطا کاری

2 : دماغی بیماری

3 : جسمانی بیماری

جرمیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ جب فرد سماج کے تسلیم شدہ اور پسندیدہ طریقوں کے مطابق اپنا رول ادا نہیں کر سکتا یا دوسرے الفاظ میں وہ سماج کے مروجہ اصولوں اور قانون کی پابندی سے گریز کرتا ہے تو وہ مجرم قرار پاتا ہے۔

سماج کے ہر فرد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی اور اپنے سے وابستہ لوگوں کی نگہداشت کرے گا لیکن جب مختلف وجوہ کی بنا پر اپنی ذمہ داریوں کو پوری نہیں کر سکتا تو وہ بعض اوقات غیر سماجی ترکتوں کا مرتکب ہوتا ہے جیسے چوری وغیرہ۔

بعض ایسے بھی افراد ہوتے ہیں جو متوقع رول کو انجام نہ دینے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مختلف نفسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے neurosis اور psychosis وغیرہ۔

نفسیات کی تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ دماغ پر بار پڑتے اور عصبی تناؤ اور کھنچاؤ کی وجہ سے انسان جسمانی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ بعض قسم کے پھوڑے یعنی ulcers انہی حالات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ دماغی اور جذباتی ہیجان کی وجہ سے قلبی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ قلبی امراض کو کم کرنے کے لیے ہیجانی کیفیتوں سے دور رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح اعصابی اور جوڑوں کا درد بھی اکثر و بیشتر عورتوں میں انہی کیفیتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غرض رول کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے نفسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور نفسی بیماریوں کا بلاواسطہ اثر جسمانی صحت پر پڑتا ہے۔

حیثیت یا STATUS

ہر رول کے ساتھ کچھ نہ کچھ مرتبہ یا حیثیت وابستہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان اپنی حیثیت یا مرتبے کے لحاظ سے مخصوص رول انجام دیتا ہے۔

"Status is the social position identified in

the society as associated with a role, a pattern of behavior expected or required under given circumstanas from persons occupying the position."

یعنی "حیثیت ایک سماجی پوزیشن ہے جس کا سمبندھ رول سے ہونے کی وجہ سے سماج میں افراد کی نشاندہی ہو سکتی ہے اور جو شخص اس پوزیشن کا حامل ہوتا ہے اس سے مخصوص برتاؤ کی توقع کی جاتی ہے۔"

رالف لنٹن (Ralph Linton) نے حیثیت پر کافی تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق

"A role represents the dynamic aspect of status."

یعنی "رول حیثیت کے حرکیاتی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔"

جب کوئی شخص اپنی حیثیت سے وابستہ تمام حقوق اور فرائض کی انجام دہی میں لگا رہتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا رول ادا کر رہا ہے۔ رول اور حیثیت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں میں صرف علمی لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب طالب علموں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسکول کے ضابطوں کی پابندی کریں گے تو اسی طرح اسکول سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ طالب علموں کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں حصہ لے گا۔ غرض ہر حیثیت کے ساتھ کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں اور فرائض وابستہ ہوتے ہیں۔ سماج میں جس کسی کی جتنی زیادہ اونچی حیثیت ہوتی ہے اسی لحاظ سے وہ انتہائی ذمہ دارانہ رول انجام دیتا ہے۔ جب فرد کو اپنی حیثیت اور اس سے متعلقہ رول کا اندازہ ہو جاتا ہے تو اس کی توجہ ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض پر مرکوز ہو جاتی ہے جو اس سے متعلق ہوتی ہیں۔ کسی بھی سماج میں ہم آہنگی اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتی جب تک کہ لوگ اپنی حیثیت کے لحاظ سے بخوبی رول کی انجام دہی پر توجہ نہ دیں۔

سماجیات کے ماہر حیثیت کی دو نوعیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱: انتسابی حیثیت *achieved Status*

2: اکتسابی حیثیت Ascribed Status

انتسابی حیثیت کی نوعیت پیدائشی ہوتی ہے۔ اس حیثیت کو حاصل کرنے میں فرد کی ذاتی صلاحیتوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر جن ملکوں میں شہنشاہیت کا رواج ہے وہاں وراثت کی بنا پر شہزادہ باپ کے انتقال کے بعد بادشاہ بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے:

"Ascribed statuses are those which are assigned to individuals without reference to their innate differences or abilities. They can be Predicated or trained for from the moment of both."

یعنی "انتسابی حیثیتیں وہ ہوتی ہیں جو پیدائشی صلاحیتوں یا فرق کو ملحوظ رکھے بنا حاصل ہوتی ہیں۔ پیدائش کے لمحے ہی سے افراد کی حیثیت کے بارے میں پیشن گوئی کی جاسکتی ہے اور اسی لحاظ سے انھیں ترتیب دی جاسکتی ہے۔"

جہاں تک انتسابی حیثیت کا تعلق ہے تمام سماجوں میں عمر، جنس، جائے پیدائش اور رشتہ داری (والدین اور بچے، بھائی بہن وغیرہ) وغیرہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب یہ کہا جائے کہ "کرشنا بچہ ہے، لڑکا ہے، ورنگل کا رہنے والا ہے، ہندو ہے اور ہریجن ہے۔" تو ظاہر ہے انتساب کی تمام نوعیتیں خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔

انتسابی حیثیت کی چند نوعیتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں تبدیلی ممکن ہے اور چند جوں کی توں برقرار رہتی ہیں۔ مثلاً عمر بڑھتی جاتی ہے اور جنس برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح جائے پیدائش اور رشتہ داری برقرار رہتی ہے۔ مراسم میں فرق آسکتا ہے۔ مذہب کی حد تک فرد کو اختیار رہتا ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اپنے والدین کے مذہبی عقائد کی پابندی کرے یا دوسرے مذہب کو اختیار کرے یا بالکل لامذہبی ہو جائے۔

اکتسابی حیثیت کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ لنٹن (Linton) کے الفاظ میں:

"Achieved statuses are not assigned to persons from birth. They are left open to be

filled Through Competition and individual effort."

یعنی "اکتسابی حیثیت کسی شخص کو پیدائشی طور پر نہیں ملتی بلکہ اس کی نوعیت کھلی ہوتی ہے جس میں مقابلے اور انفرادی کوششوں سے بھرتی ممکن ہے۔

عام طور پر اکتسابی حیثیت کا انحصار تعلیم، شادی پر مبنی حیثیت اور رشتہ دارانہ نظام جو شادی کی وجہ سے قایم ہوتا ہے، پیشے اور آمدنی پر ہوتا ہے۔ اکتسابی حیثیت میں افراد کی نجی کوششوں اور محنت کا دخل ہوتا ہے مثلاً انجینئر، ڈاکٹر، وکیل، ہواباز، سائنس دان، پیشہ ور کھلاڑی اور ڈاکٹر آف فلاسفی وغیرہ۔

ہر سماج میں انتسابی اور اکتسابی حیثیت کی نوعیت جُداگانہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں عورتوں کا کسی پیشہ کو اختیار کرنا اکتسابی حیثیت کی علامت ہوگی اس کے برخلاف انسانیات کے ماہروں نے ایسے کئی سماجوں سے متعلق مواد فراہم کیا ہے جہاں عورتوں کے ذمّے نہ صرف اپنے بچّوں کی پرورش اور گھریلو ذمّہ داریاں ہوتی ہیں بلکہ وہ دوسروں کے لیے بھی کام کرتی ہیں۔ اسی طرح مرد بھی اجتماعی طور پر کئی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان سماجوں میں یہ کوئی رضاکارانہ رول نہیں ہوتے اور نہ ان کا انحصار افراد کی نجی صلاحیتوں پر ہوتا ہے بلکہ محض جنس کی بنا پر اُنھیں یہ کام انجام دینے پڑتے ہیں۔

غرض ہر سماج میں ہر فرد کو اس کی حیثیت کے مطابق رول انجام دینے ہوتے ہیں چاہے اس حیثیت کی نوعیت انتسابی ہو یا اکتسابی۔ غرض فرد کا تعلق جس طبقہ، ورذات سے ہوتا ہے اسی کے مُطابق وہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس طرح سماج میں مختلف درجوں کا جال بچھا نظر آتا ہے۔

اگرچہ سماجی درجہ بندی تمام سماجوں میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی مخصوص شکلیں مختلف سماجوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ محض کسی ایک مخصوص خصوصیت کی بنا پر سماجی درجہ بندی کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا بلکہ مختلف خصوصیتوں کے مجموعہ پر سماجی درجہ بندی کی بنیاد ہوتی ہے۔ سماجی درجہ بندی کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلے میں سماجیات کے ماہر سماجی سیڑھی (Social Ladder) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کے سب سے اونچے زینے پر سب سے اونچی

حیثیت کے افراد براجمان ہوتے ہیں اور جیسے جیسے زینے اُترتے جایئے افراد کی حیثیتوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بالآخر سب سے نیچے زینے پر شومئ قسمت کے شکار کمتر درجے کے افراد سماجی محرومیوں کے چُنگل میں گرفتار نظر آتے ہیں۔

سماج میں اس طرح کا جو بین فرق نظر آتا ہے اس کی قدر معروضی Subjective ہوتی ہے۔ کوئی پیشہ بذاتِ خود نہ تو اچھا ہے اور نہ بُرا، بلکہ جس رُجحان سے افراد کسی پیشے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس سے افراد کی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔

سماجی درجہ بندی کے افعال:

FUNCTIONS OF SOCIAL STRATIFICATION

ہر سماج میں مختلف قسم کے مشاغل (activities) پائے جاتے ہیں جو سماجی سسٹم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر خاندان کا ادارہ (institution) مختلف سماجی مشاغل کا مظہر ہے جس میں شادی بیاہ کے تسلیم شُدہ طریقے، بچوں کی پرورش وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح معاشی ادارے کے مختلف فرائض ہوتے ہیں جو پیدائش دولت، صرفِ دولت، مبادلۂ دولت اور تقسیمِ دولت کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ سیاسی ادارہ افراد کی جان اور مال کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے۔ مُلک میں امن اور امان کی برقراری، افراد کے بُنیادی حقوق کو پورا کرنے کی ذمہ داری اس کے سر ہوتی ہے۔ اس طرح مذہبی، تفریحی، تعلیمی ادارے بامقصدی (purposive) ہوتے ہیں جو اپنے اپنے فرائض علاحدہ طور پر پورا کرنے کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح ایک ادارہ کی بقا کا دار و مدار دوسرے ادارے کے وجود پر منحصر ہوتا ہے۔

سماجی ساخت کے کئی فعل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر تجہیز و تکفین کے طریقے مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن کا ایک اہم فعل حفظانِ صحت سے متعلّق ہوتا ہے جس کے ذریعے مُردہ جسم کا جلد سے جلد دفن ہو جانا یا جلا دینا ضروری ہے۔ اس طرح سماجی ساخت کے بعض افعال عیاں (manifest) اور بعض مخفی (latent) ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بعض افعال ارادی اور تسلیم شُدہ ہوتے ہیں اور بعض منفی۔ مثال کے طور پر معاشی نظام کے واضح اور عیاں فعل دولت کی فراہمی اور پیدائش دولت میں اضافہ ہے جو قوی استحکم .

کے لیے ضروری ہے لیکن اس معاشی نظام کے ڈھانچے میں آجر اور مزدور کی حیثیت واضح رہتی ہے، جن کے درمیان اکثر و بیشتر کھلی (open) اور چھپی (hidden) سرد جنگیں جاری رہتی ہیں لہٰذا کارل مارکس (Karl Marx) کے الفاظ میں دُنیا کی تاریخ بر ژوائی اور پرولتاری داستان نوسے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح معاشی بحران سے ایک مخصوص گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

مختلف سماجی نمونوں (Social Patterns) کے اثرات مختلف طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور ایک ہی سماجی پیٹرن کا مثبت یا منفی اثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لکڑی کی صنعت مثبت حیثیت کی حامل ہے جس کی وجہ سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر، ضروریات اور زیبائش کی اشیاء کی تیاری میں لکڑی کی بیش بہا اہمیت ہے۔ لیکن اس کا منفی پہلو بھی ہے جو جنگلات کے ضایع ہونے، تفریحی اور شکاری مقامات کی کمی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان ہی منفی نتیجوں کو dysfunctional کہا جاتا ہے۔

یہ تو واضح ہو گیا کہ سماجی درجہ بندی کے ظاہر اور مخفی فعل ہوتے ہیں اور یہ دونوں فعل سماج کے مختلف گروہوں پر مختلف طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح سماجی سسٹم کی بقاء کا انحصار درجہ بندی پر ہوتا ہے۔ درجہ بندی ایک ایسا میکانزم ہے جس کے ذریعے سماج کے مختلف برت (strata) سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے حقوق اور فرائض کو مدِنظر رکھتے ہوئے سماج میں مختلف رول انجام دیتے ہیں۔ غرض درجہ بندی افراد کے طرز برتاؤ کی اس طرح وضاحت کرتی ہے کہ سماج کی توقعات اور سماجی قدروں کا اندازہ ہو جاتا ہے

سماجیات کے بعض مفکرین سماجی سسٹم کے لیے سماجی درجہ بندی کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ ان کی توجیہہ کے مطابق اگر سماج ایک تفاعلی میکانزم (functional nechanism) سمجھا جاتا ہے تو سماجی درجہ بندی ضروری ہے کیونکہ ہر سماج میں مشاق اور غیر مشاق، ہنرمند اور غیر ہنرمند، ماہر اور غیر ماہر سب ہی پائے جاتے ہیں۔ ان میں کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی انجینئر، کوئی سائنس داں ہے تو کوئی معلم، کوئی فن کار ہے تو کوئی معمار، غرض مختلف پیشوں اور فنون سے تعلق رکھنے والے افراد سماج کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ لہٰذا سماج کے مختلف افراد کا مختلف سماجی حیثیتوں پر انتخاب ضروری ہے ان میں اس احساس کا اجاگر ہونا ضروری ہے کہ وہ مختلف علوم اور فنون میں مہارت حاصل کر کے بلند سے بلند تر سماجی حیثیت کو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر سماج میں ہر فرد کو اس کی پسند کا کام تفویض

کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہر فرد کا فرضِ منصبی سماج کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ سماج کے مختلف مشاغل کو انجام دینے کے لیے مہارت درکار ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر سماج اپنے سے وابستہ افراد کو مخصوص سماجی حیثیتوں پر فائز ہونے کا اہل بننے کی ترغیب دیتا رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کو کس طرح مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دی جا سکتی ہے؟ ماہرین سماجیات کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں انعام واکرام اور کام کے بہترین صلے کے ذریعے موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی سماج میں بہترین کارگردگی کا معاوضہ اونچی سماجی حیثیت اور بروقت ترقی کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے تو سماجی آہنگی کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن کوئی سماجی سسٹم تمام افراد کے لیے اس قسم کے صحت مند ذرائع فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ rewa-
rd system کے ذریعے بہت محدود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں عدم مساوات یا نابرابری پائی جاتی ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ متحرک اور ترقی یافتہ سماجوں میں عدم مساوات پر بڑی حد تک قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی سماجی درجہ بندی عدم مساوات کو پیدا کرنے کی ایک ضروری شکل بن جاتی ہے جس کی وجہ سے افراد کی اَن گنت تعداد اپنی مخفی صلاحیتوں سے لاعلم جہالت اور غربت کا شکار بنی رہتی ہے۔ ہر سماج میں ایسے بھی افراد کی کثیر تعداد ہوتی ہے جنھیں اس کا بخوبی احساس رہتا ہے کہ چاہے وہ کتنی ہی جان توڑ محنت کیوں نہ کریں پھر بھی سماجی درجہ بندی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنی توقعات کو پوری نہیں کر سکتے کیونکہ انھیں نہ تو بروقت رہبری ملتی ہے اور نہ انھیں وقت پر صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نہ تو انھیں بروقت اپنی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح سماجی درجہ بندی کا سسٹم اپنے منفی روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ترقی یافتہ سماجوں کے مقابلے میں روایتی سماج قدامت پسند ہوتے ہیں۔ وہ تبدیلی کی طرف آسانی سے مائل نہیں ہوتے اس لیے افراد میں اپنی حیثیتوں کو بدلنے کا زیادہ تر رجحان نہیں پایا جاتا۔ ان میں خدا داد قناعت پسندی (divine Contenwent) پائی جاتی ہے۔

یہاں پر ایک دلچسپ سماجیاتی مظہر بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ ترقی یافتہ سماجوں میں جو افراد اہم اور ذمہ دارانہ سماجی حیثیتوں پر براجمان ہوتے ہیں وہ اپنی حیثیت سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی تبدیلی کی طرف مائل نہیں ہوتے مثلاً

صاحبِ جائیداد افراد کسی حیثیت کے حقوق سے متعلق تبدیلی کو پسند نہیں کرتے چاہے ان کا تعلق کسی ملک اور سماج سے ہو۔ اسی طرح ہندوستان کے برہمن اور امریکہ کی گوری نسل اپنی برتر سماجی حیثیت (Status quo) کو بدستور برقرار رکھنا چاہتی ہے۔

طبقہ: CLASS

سماجی تخیل کی تاریخ میں کارل مارکس نے سماجی اور معاشی طبقوں کی کشمکش کا ذکر جن واضح لفظوں میں کیا ہے اس طرح کے خیالات کسی دوسرے مفکر کے پاس نہیں ملتے۔ کارل مارکس طبقاتی کشمکش کو سماجی تبدیلی کا اہم ماخذ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ایک سو سال سے سماجیاتی تخیل پر کارل مارکس کے غور و فکر کا بہت گہرا اثر پڑا۔

کمیونسٹ منشور (Communist Manifesto) کی ابتدا ہی کارل مارکس نے اس جملے سے کی ہے:

"The history of all hitherto existing societies is the history of class struggles."

یعنی "اب تک کی تمام سماجوں کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔"

طبقوں کے آغاز کے بارے میں مارکس کا کہنا ہے کہ سماج میں افراد جو مختلف رول ادا کرتے ہیں اس کی وجہ سے طبقے وجود میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے کارل مارکس کے نزدیک سب سے اہم پیداواری دولت کے طریقے ہیں جن میں زراعت اور مختلف قسم کی صنعتیں شامل ہیں۔ زراعت کے میدان میں سب سے اہم حیثیت زمیندار اور کسان کی ہوتی ہے اور صنعتی نظام میں آجر اور مزدور کی۔

بورژوائی نظام (bourgeois system) کے تحت جن افراد کے قبضے میں کارخانے ہوتے ہیں وہ اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس استحصال کی بنا پر مزدوروں میں بے چینی ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن بورژوائی نظام کو حکومت کا اس قدر تعاون حاصل رہتا ہے کہ مزدوروں کے مطالبات صدائے بازگشت ثابت ہوتے ہیں۔

بورژوائی سسٹم کے لیے ایسی حالت اور بھی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے جب کہ مزدوروں میں اتحاد نہ ہو اور ان کی کوئی تنظیم ان کی نمائندگی کرنے کے لیے موجود نہ ہو اور نہ ہی ان میں

تنا شعور ہو کر وہ آجروں کے خلاف آواز بلند کر سکیں۔ اس لحاظ سے مارکس کے سماجی تخیل میں تین اہم تصوروں کی طرف اشارہ ملتا ہے:

۱۔ طبقاتی شعور Class censciousness

2۔ طبقاتی ہم آہنگی Class solidarity

3۔ طبقاتی تصادم Class Conflict

طبقاتی شعور سے مراد وہ احساس ہے جس کی بنا پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ دولت کے پیدائشی طریقوں میں مزدوروں کا کیا رول ہے اور ان کا سرمایہ دارانہ طبقے سے کیا تعلق ہے؟ شعور سے یہ بھی مراد ہے کہ مزدور اس بات کو سمجھ سکیں کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں ان کا استحصال ہو رہا ہے اور وہ کس طرح ان کا خون چوس کر اپنی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ شعور کی انتہائی صورت مزدور طبقوں کے اتحاد میں ظاہر ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ متحد ہو کر سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت پر تُل جاتے ہیں تاکہ ان کے حق میں انصاف کیا جا سکے۔

طبقاتی ہم آہنگی سے مراد مزدوروں کی وہ متحد جد وجہد ہے جس کی بنا پر وہ اپنے معاشی اور سیاسی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

طبقاتی تصادم کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

۱: غیر شعوری جد وجہد unConscious struggle

2: شعوری جد وجہد Conscious struggle

غیر شعوری جد وجہد مزدوروں اور سرمایہ داروں میں اس وقت اپنے اپنے فائدے کے لیے جاری رہتی ہے جب کہ ان میں طبقاتی شعور پوری طرح سے اجاگر نہیں ہوتا۔

شعوری جد وجہد اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ مزدوروں کو اپنے استحصال کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ان پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تاریخ میں ان کا کتنا زبردست رول کیا ہے۔ اس احساس کی بنا پر وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اجتماعی طور پر جد وجہد کرتے ہیں اور پیدائش دولت کے ذریعوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

مارکس اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ اگر مزدوروں میں خود اعتمادی کی جذبہ جاگزیں رہے اور وہ قسمت کے ہاتھوں اس فلسفے پر قناعت نہ کریں کہ دوسری جنم میں انھیں محنت کا معاوضہ مل جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ مزدوروں کی حالت بہتر نہ ہو۔ لیکن جب مزدور سرمایہ

داروں سے ہر قسم کی مفاہمت پر تیار ہو جاتے ہیں تو مارکس اس حالت کو جھوٹا شعور "false con-sciousness" کہتا ہے۔

ہمعصر سماجیاتی تحقیق پر کارل مارکس کے فلسفے کا اثر جرمن سماجی مورخ ماکس ویبر (Max Weber) پر بہت زیادہ پڑا جو معاشیات اور سماجیات کا ایک زبردست مفکر تھا۔

ویبر اس حد تک کارل مارکس سے متفق نظر آتا ہے کہ وہ سماجی درجہ بندی میں معاشی عنصر کو بہت زیادہ نمایاں سمجھتا ہے۔ ویبر اور مارکس دونوں اس خیال کے حامی تھے کہ ملکیت پر قابو پانے کی وجہ سے کسی فرد یا طبقے کے لیے بہتر زندگی گزارنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح ویبر معاشی پہلو کے ساتھ اور دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں سے ایک اقتدار یا power ہے اور دوسرا وقعت یا قدر و منزلت یعنی prestige۔ ویبر کے سماجی تخیل کے لحاظ سے جائیداد، اقتدار اور قدر و منزلت وہ تین اہم عنصر ہیں جن کی بنا پر سماج کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح جائیداد یا ملکیت کے فرق کی وجہ سے طبقے وجود میں آتے ہیں، اقتدار کی وجہ سے سیاسی جماعتیں نمودار ہوتی ہیں اور قدر و منزلت کے فرق کی وجہ سے حیثیت یا سماجی پرتیں (social strata) ظاہر ہوتی ہیں۔

مارکس اور ویبر کے بعد سماجیاتی تاریخ میں اہم نام رابرٹ لنڈ (Robert Lynd) کا ہے جس کی اہم تصنیف "Middletown" اس امر کی شاہد ہے کہ معاشی اثرات سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اداروں پر بڑے گہرے اور دور رس پڑتے ہیں۔ لنڈ کے بعد لائیڈ وارنر (Lloyd Warner) ہے اور سب سے زیادہ سی رائٹ ملس (C. Wright Mills) کی تصنیف "The power Elite" ہے۔ اس کتاب میں ملس سماجی تعلقات کی بنیاد اقتدار کو قرار دیتا ہے۔

طبقے کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد طبقے کے مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے۔

"A social class Consists of a number of people who have approxinately equal positions in society, which may be achieved rather than ascribed, with some apportunity for movement upward or down ward to ano-

ther class."

یعنی "سماجی طبقہ افراد کی اس اکثریت پر مشتمل ہوتاہے جن کی سماج میں کم و بیش یکساں حیثیت ہوتی ہے۔ طبقہ کی نوعیت اکتسابی ہوتی ہے نہ کہ انتسابی جس کی بنا پر دوسرے طبقے میں اونچی یا نیچی حیثیت حاصل کرنے کے کچھ موقعے ہوتے ہیں۔"

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سماجی طبقہ میں افراد کی ایسی اکثریت ہوتی ہے جن کا سماج میں مساوی مقام ہوتاہے تو یہ اشارہ دراصل ان واضح زمروں (categories) کی طرف ہوتاہے جن کی بنا پر افراد کو اعلاء، متوسط اور غریب طبقوں میں تقسیم کیا جاتاہے۔ اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بلند تر سماجی حیثیتوں اور مراعات کے حامل ہوتے ہیں اور یہ لوگ متوسط اور کمتر طبقوں پر چھائے رہتے ہیں۔ غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد جہالت اور نکبت میں گرفتار ہر قسم کی سماجی ناانصافیوں کا شکار بنے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ طبقوں کا تعین کس طرح ہوتاہے؟ کیا آمدنی طبقوں کا تعین کرتی ہے؟ کیا جمع شدہ دولت طبقوں کی ذمہ دار ہے؟ کیا پیشوں کی نوعیت طبقاتی نظام کی ضامن ہے؟ سائنسی لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں سے بذات خود کوئی ایک عامل طبقاتی نظام کا باعث نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ طبقوں کی ساخت میں ان تینوں عاملوں کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔

سماجیات کے اکثر و بیشتر ماہرین نے سماجی طبقوں کی تین طرح سے تقسیم کی ہے:

1 : تین طبقاتی سسٹم Three-class System
2 : دو طبقاتی سسٹم Two-class System
3 : کئی طبقاتی سسٹم Multiple-class System

تین طبقاتی سسٹم میں اعلا، متوسط اور غریب لوگ شامل ہیں۔
دو طبقاتی سسٹم میں سرمایہ دار اور مزدور۔
کئی طبقاتی سسٹم میں امیروں میں امیر، متوسط میں متوسط اور غریبوں میں غریب۔

سماجی طبقوں کا معیار: CRITERIA OF SOCIAL CLASS

سماجی طبقوں کے وجود کو تقویت پہنچانے میں جو عوامل نمایاں ہیں ان میں خاندانی

شہرت، پیشہ، دولت کی ذخیرہ اندوزی، اقتدار، تفریح کے وافر موقعے، تعلیمی معیار، رہائش کا مقام، معیار زندگی اور شائستہ مذاق داخل ہیں۔

جہاں تک خاندانی شہرت کا تعلق ہے طبقاتی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے خاندانی عظمت اور وقار کی روایتوں کو انتہائی فخر سے ایک پیڑی سے دوسری پیڑی میں منتقل کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ خاندانی شجرہ اور خاندانی طرز برتاؤ کے نمونوں کا ذکر اکثر و بیشتر کیا جاتا ہے۔ آباؤ اجداد کے تعلیمی اور اصلاحی کارناموں اور ان کی اونچی سماجی حیثیت کو دہرایا جاتا ہے۔

خاندانی سطوت اور ناموری سے جن عوامل کا براہ راست تعلق ہوتا ہے وہ پیشے کی نوعیت ہے۔ افراد جس طبقے سے روپیہ کمانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اس کا تعلق بڑی حد تک طبقہ کی نوعیت سے ہوتا ہے۔ یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ افراد کس طرح کتنا روپیہ بناتے ہیں؟ روپیہ کمانے کے صحت مند اور غیر صحت مند ذریعے ہوتے ہیں اس لیے صحت مند ذریعوں سے جو روپیہ کمایا جاتا ہے اس کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہو سماج میں ایسے افراد کا وقار باقی رہتا ہے بہ نسبت ان افراد کے جو غیر صحت مند طریقوں کو اپنا کر اور سماج دشمن عناصر کا شکار ہو کر ہزاروں اور لاکھوں روپیہ کماتے ہیں۔

مختلف پیشوں کے ساتھ جو سماجی قدر وابستہ ہوتی ہے وہ کوئی مطلق نوعیت کی حامل نہیں ہوتی بلکہ زمانے کے تقاضوں اور سماج کے بدلتے ہوئے رجحانوں کے ساتھ مختلف پیشے باعزت سمجھے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں رشی، منی، پنڈت، مرشد، گروہ اور عامل کی بڑی عزت ہوتی تھی لیکن اس زمانے میں کوئی بھی اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دینا نہیں چاہتا بلکہ ہر ایک انہیں سائنس داں، محقق، ڈاکٹر، انجینئر اور پروفیسر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں نرسنگ عورتوں کے لیے انتہائی شریفانہ پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ دیوداسیوں کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن اب ان دونوں پیشوں میں ایسے غیر صحت مند عنصر شامل ہو گئے ہیں کہ لوگ اس طرف راغب نہیں ہوتے۔ غرض ہمعصر سماجی قدر پیشوں کی نوعیت کا تعین کرتی ہے۔

دولت اندوزی کی ہم چاہے کتنی ہی برائی کیوں نہ کریں لیکن طبقاتی نظام میں اونچے طبقے کا تعین جائیداد، زیور اور نقد رقم کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی بھی سماج میں اعلا، متوسط اور نیچے طبقوں سے تعلق رکھنے کے لیے رقم مقرر نہیں کی جاتی لیکن لوگوں کے ذہن میں

اُونچے طبقے سے متعلق مال و دولت کا اندازہ ضرور رہتا ہے۔

دولت کا براہِ راست تعلق اقتدار سے ہوتا ہے۔ ملس (Mills) نے اس موضوع پر کافی تحقیقی مواد اکٹھا کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ طبقوں کی تقسیم اقتداری ساخت (power Structure) پر کی جانی چاہیے۔ اقتداری طبقہ حکمراں طبقہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ یہی طبقہ قانون بناتا اور نافذ کرتا ہے۔

تھورسٹائن ویبلن (Thorstein Veblen) نے بڑی قابلِ قدر تحقیقیں "The Theory of the leisure class" پر کی ہے۔ اس تحقیقی کام میں اُنھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جن افراد کے پاس کافی فرصت اور دولت ہوتی ہے وہ بڑی حد تک اپنے رُجحانوں اور خواہشوں کے مُطابق زندگی گزارتے ہیں اور جس معیار پر یہ اپنے فرصت کے اوقات تفریحی مشاغل پر صرف کرتے ہیں ان سے معاشی خوشحالی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے اسکول کے مقابلے میں کالج اور کالج کے مقابلے میں یونیورسٹی سے ڈگری لینے والوں کی بہت زیادہ عزّت کی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں لسانیات اور سماجی علوم کے مقابلے میں فنی اور پیشوں کی تعلیم کا رواج بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے پیشوں کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ غرض وہی تعلیم سب سے بامعنی سمجھی جاتی ہے جس کا اظہار کسی اعلا سماجی حیثیت کو اختیار کرنے میں ظاہر ہو۔

رہائشی جگہ اور معیارِ زندگی سے بھی طبقہ کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ افراد اپنی رہائش کے لیے جن محلّوں کا انتخاب کرتے ہیں اس کا دار و مدار ان کی آمدنی پر ہوتا ہے۔ جن افراد کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے ان کا رُجحان شہر سے دُور، کُھلے اور اُونچے مقامات پر رہائشی مکان تعمیر کروانے کا ہوتا ہے اور وہ ان محلّوں کو ترجیح دیتے ہیں جہاں ان کی حیثیت کے لوگ رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف متوسط اور غریب لوگ ان محلّوں کو ترجیح دیتے ہیں جہاں آمد و رفت کی سہولتیں ہوں۔ بازار، اسکول، اور دواخانے وغیرہ قریب ہوں۔

اُونچے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی کُھلی نشانیاں ان کا اُونچا معیارِ زندگی اور زندگی کی سہولتیں ہوتی ہیں جن میں کُھلے اور کُشادہ مکان، موٹر، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، فرج، بجلی کے

سامان، نوکر چاکر وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے اُونچے معیارِ زندگی کی نشان دہی ان تمام بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے سامان سے ہوتی ہے جو وہ روزانہ استعمال کرتے ہیں اور ایسے سامان کی دُگنی تگنی قیمت ادا کرنا ان پر بار نہیں گزرتا۔

افراد جس طریقے سے زندگی گزارتے ہیں اس میں مذاق یا taste کا بہت زیادہ دخل ہوتاہے۔ رہنے سہنے کے طریقے، پہننے اوڑھنے کے ڈھنگ، گھر کی سجاوٹ سب ہی افراد خاندان کے مذاق کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس طرح افراد ایک چیز کے مقابلے میں دوسری چیز کو ترجیح دیتے ہیں اس سے ان کی سماجی حیثیت کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اُونچی سماجی حیثیت رکھنے والے یا دولت مند فرد کا مذاق شائستہ ہو۔ یہ کوئی مطلق معیار نہیں ہے بلکہ اضافی نوعیت کا حامل ہے۔ متوسط اور غریب گھرانے کے ایسے بیشتر افراد ہوتے ہیں جن کا نکھرا ہوا مذاق اُونچے طبقے سے تعلق رکھنے والوں سے کئی گُنا اُونچا ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ سماجی طبقوں کی تشکیل کے لیے جن عوامل کا ذکر کیا گیا ہے ان کی نوعیت اضافی ہوتی ہے۔ طبقاتی امتیاز ایسی پیمائش کی اسکیل ہوتاہے جس پر ہم اپنی سمجھ کے مطابق نشان لگاتے جاتے ہیں کہ ہم دوسروں سے کس حد تک برتر، برابر اور کمتر ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض سماجوں میں طبقاتی نظام بہت سخت ہوتاہے اور افراد کا ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ شریک ہونا "ذات باہر" کیے جانے کا موجب بنتا ہے لیکن تمام ترقی یافتہ ملکوں میں "open class" سسٹم پایا جاتا ہے جس کی بنا پر افراد اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں میں اضافہ کرکے بہتر سماجی حیثیتوں کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

ذات پات کا نظام: CASTE SYSTEM

یوں تو طبقاتی نظام اور نسلی امتیاز پر مبنی گروہ اکثر سماجوں میں پائے جاتے ہیں لیکن کسی سماج میں سماجی بین عمل اور آپسی میل ملاپ پر اتنی پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں جتنی کہ ہندو سماج میں ذات پات کے نظام کی وجہ سے سماجی ربط کا دائرہ انتہائی تنگ کر دیا گیا ہے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں جیسے رگ وید (Rig Veda) اور بھگوت گیتا (Bhagavadgita) میں چار ذاتوں کا حوالہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتاہے کہ ذات

پات کا نظام ہند و مذہب کا جزو ہے :

۱ : برہمن — The Brahmans
2 : کسترِیا — The Kshatriyas
3 : وائشیا — The Vaishyas
4 : شودر — The Shudras

ان چار ذاتوں کے علاوہ ایک اور کمتر ذات ہے جنھیں عام طور پر "outcastes" یا "untouchabbs" کہا جاتا ہے، لیکن ان چار اہم ذاتوں کے علاوہ اور بے شمار ذیلی ذاتیں ہیں اسی لیے کہا گیا ہے :

"The fourfold caste is merely a theoretical division of society... it is a sociological fiction."

یعنی یہ چار ذاتیں تو محض سماج کی نظری تقسیم ہے ... یہ ایک سماجیاتی افسانہ ہے۔ کیوں کہ ہر ذات اتنی بے شمار ذیلی ذاتوں پر مشتمل ہوتی ہے کہ ان کی تعداد تین ہزار سے اُوپر ہے اور ان سے متعلقہ لوگ ایک دوسرے کو کمتر اور ایک دوسرے کو ناپاک اور نجس سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے، کھانے پینے اور شادی بیاہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس طرح "Caste within Caste" کا اتنا پیچیدہ جال بن گیا ہے کہ اس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

ذات کے لیے انگریزی زبان میں "Caste" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو پرتگالی زبان سے لیا گیا ہے۔ سنسکرت میں ذات کے تصوّر کو واضح کرنے کے لیے دو لفظ ایک "ورنا" اور دوسرا "جاتی"، استعمال کیا جاتا ہے۔

"Varna meaning colour used to specify the orders in society. The word "Jati" is specialised to denote caste, which is a group the membership of which is acquired by birth. The word "Jati" means something into which

one is born.

یعنی "ورنا کے معنی رنگ کے ہیں جن سے سماج کی ترتیب کی وضاحت ہوتی ہے۔ لفظ 'جاتی' سے ذات مُراد ہے۔ جو ایک ایسا گروہ ہے جس کی رُکنیت پیدایش سے حاصل ہوتی ہے۔ "جاتی" کے معنی ہیں جس میں کسی کی پیدایش ہو۔"

ہندوستان میں دو ہزار پانچ سو سے زیادہ ہی "جاتی" پائے جاتے ہیں۔ "جاتی" میں درون گروہ شادی (endagamous group) کا طریقہ رائج ہے ان کے زندگی گزارنے کے مخصوص طریقے ہوتے ہیں جس کی پابندی اٹل ہوتی ہے۔ "جاتی" کی معاشی اہمیت یہ ہے کہ یہ پیشہ ورانہ گروہ ہوتے ہیں اور روایتی دیہی معیشت (traditional rural economy) میں ان ہی کے ذریعے اشیاء اور خدمتوں کا مبادلہ ممکن تھا۔

سماجیاتی نقطۂ نظر سے جو نکتہ اہم ہے وہ یہ کہ سماجی درجہ بندی کی حیثیت سے ذات واری نظام کی ابتدا اور اس کی بقا کے کون سے عامل ذمّہ دار ہیں؟ پہلے نکتے کی وضاحت کے سلسلے میں جی۔ ایچ۔ ہُٹن (J. H. Huttan) نے تاریخی نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ جب آریا ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو انھیں کالے رنگ کے، چپٹی ناک والے دراوڑیوں سے نفرت ہونے لگی۔ انھیں وہ کمتر سمجھ کر بالکل معمولی درجے کا کام لینا شروع کر دیے۔ اس وقت خود مقامی آبادی کئی قبائلی گروہوں میں منقسم تھی جن میں ایک دوسرے سے میل ملاپ پر پابندیاں تھیں۔ آریاؤں نے سماجی فاصلہ (Social distance) برقرار رکھنے کے لیے اسی مقامی اصول کو مذہبی شکل دے کر آپسی میل ملاپ کو نجس قرار دیا۔

اس نظام کی بقا کے سلسلے میں ایم۔ این۔ سری نواس (M.N.Srinivas) کا خیال ہے کہ قدیم مذہبی ادب میں کرما (Karma) کا تصوّر پایا جاتا ہے جس کی بناء پر افراد کے ذہن نشین یہ اصول کروایا جاتا ہے کہ کسی خاص فرد کی پیدایش ایک مخصوص ذیلی ذات میں اس لیے ہوئی ہے کہ وہ اسی ذات میں پیدا ہونے کا مستحق تھا۔ جہاں تک دھرما (dharma) یا فرائض کی انجام دہی کا تعلّق ہے وہ دراصل ذات واری نظام میں درجہ بندی کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے:

"*The concept of pollution is fundamental to the caste system and every type of caste*

relation is governed by it."

سری نواس کے لحاظ سے "نجاست کا تصوّر ذات پات کے نظام کا سب سے بنیادی پہلو ہے اور ذات پات کے متعلق ہر قسم کے تعلّقات پر یہی تصوّر حاوی رہتا ہے۔" البتہ کے۔ ایم۔ پانیکر (K.M. Panikar) ورنہ اور جاتی کے تصوّر کو واضح کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ ذات پات کا نظام ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے بلکہ وہ ہندو روایتی قانون (Hindu traditional law) اور مرکزی سیاسی اقتدار کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ پانیکر کے ان خیالوں سے اکثر ہندوستانی سماجیات کے ماہرین متفق نہیں ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ خود ہندو روایتی قانون پر مذہبی تصوّرات غالب ہیں۔ کرما اور دھرما کا فلسفہ اور ناپاکی کا تصوّر اتنا مذہبی اور قانونی شکل اختیار کیے ہوئے ہے کہ یہ سب ذات پات کے نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مجمدار اور مدن کے الفاظ ہیں:

"Caste in India is a social institution deriving sanction from and intimately interwoven with the Hindu religion."

یعنی "ہندوستان میں ذات پات کے سماجی ادارے کو ہندو مذہب کی تائید حاصل ہے اور جس کے تانے بانے ہندو مذہب میں گتھ گئے ہیں۔"

پروفیسر سری نواس نے ذات پات کے نظام کی تعریف اس طرح کی ہے:

"A caste is a hereditary endogamous usually localised group, having a traditional association with an occupation and a particular position in the local hierarchy of castes."

یعنی "ذات ایک موروثی، درون گروہ بیاہی، مقامی گروہ ہے جس کے ارکان روایتی طور پر کسی پیشے سے منسلک ہوتے ہیں اور جسے مقامی درجہ بندی میں ایک خاص مقام حاصل رہتا ہے۔"

آگے چل کر پروفیسر سری نواس اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ مختلف ذاتوں کے مابین تعلّقات بالکلیہ چھوت چھات اور نجاست کے تصوّرات پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے مختلف

ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ کھانے پینے اور میل جول سے نجاست کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے:

"A caste system is an arrangment of status relationships that prevents people from achieving higher status or social position than was accorded them at birth."

یعنی "ذات پات کے نظام کی وجہ سے حیثیتی تعلقات اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ جس کی بنا پر پیدائش کی وجہ سے لوگوں کو جو حیثیت حاصل ہے اس سے اونچی حیثیت یا سماجی پوزیشن حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے"۔

ذات کے نظریے: THEORIES OF CASTE

ذات پات کے نظام کی ابتدا کے بارے میں مفکّرین نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں جن پر نظر ڈالنے سے اس نظام کی شدّت اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

1: ذات پات کی ابتدا کا خداداد نظریہ The Theory of the Divine Origin of Caste.

2: ذات پات کا کرمائی نظریہ The Karma Theory of Caste.

3: ذات پات کا فعلیتی نظریہ The Functional Theory of Caste.

جہاں تک ذات پات کی ابتدا کے خداداد نظریے کا تعلق ہے بھگوت گیتا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ برہمن بھگوان کے مُنہ سے پیدا کیے گئے ہیں، کھتری بازوؤں سے، وائی شیا پیٹ سے اور شودر پیروں سے۔ بھگوت گیتا میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ بھگوان نے سب سے پہلے تین ذاتوں یعنی برہمن، کھتری، وائی شیا کی تخلیق کی اور سب سے آخر میں شودر کی طرف توجّہ کی تاکہ وہ سب کی خدمت کر سکیں۔

ذات پات کے کرمائی نظریے کے مطابق ہر شخص کی موجودہ ذات اس کی پچھلی زندگی کی سزا یا جزا کا نتیجہ ہے۔ عام طور پر ہندو آواگون (Transmigration of Soul) میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ہر فرد اس دُنیا میں جس قسم کی زندگی گزارتا ہے اور جتنی نیکیاں یا

بُرائیاں کرتا ہے اسی کے مطابق وہ مرنے کے بعد دوسرے روپ میں برہمن یا شودر کلیان یا چنڈال، حیوان یا پرندہ بن کر پیدا ہو سکتا ہے۔ مر مر کر پیدا ہونے یا پیدا ہو ہو کر مرنے کے چکر سے اُسے مکتی نصیب ہوتی ہے۔

ذات پات کے فعلیتی نظریے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ان اہم چار ذاتوں یعنی برہمن، کھتری، وائی شیا اور شودر کے ذمّے کیا فرائض ہیں؟ چونکہ برہمن بھگوان کے مُنہ یعنی "mukha" سے پیدا کیے گئے ہیں اس لیے وہ گُرو یعنی استاد اور پجاری رہیں گے۔ کھتری بھگوان کے بازوؤں سے پیدا ہونے کی وجہ سے ایسے تمام فرائض انجام دیں گے جن کا انحصار جنگجویانہ صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ سپاہی اور حاکم ہوں گے۔ وائی شیا چونکہ بھگوان کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذمّے بیوپار اور تجارت ہوگی اور سب سے کمتر ذات چونکہ شودر کی ہے جو کہ بھگوان کے پاؤں سے پیدا کیے گئے ہیں انھیں ہر قسم کے معمول کام کرنے ہوں گے۔ وہ کھیتی باڑی میں لگے رہیں گے۔ یعنی کھودنا، بیج بونا، زمین جوتنا، ہل چلانا، فصل کی کٹوائی غرض ان کا کام تین بڑی ذاتوں کی خدمت کرنا ہوگا۔

برہمنوں کا کام دوسری تین ذاتوں کے مقابلے میں کافی قدر و منزلت کا ہے۔ درس و تدریس، پوجا پاٹھ، مقدّس کتابوں کا پڑھنا اور پڑھانا اور بھگوان کو نذر چڑھانا صرف برہمن ہی کر سکتے ہیں۔ برہمن ان تمام مقدّس کاموں کی انجام دہی اس وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ برہمچاری (Brahmacharya) بن جاتا ہے۔

رگ وید میں کھتریوں کو "Rajanya" کہا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ذمّے اقتدار ہوتا ہے۔ ان میں تمام امرا اور شرفا شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ برہمنوں کے مقابلے میں کھتری کم درجے کے ہوتے ہیں لیکن بعض صورتوں میں کھتری کا خاندان برہمن کے خاندان کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب کہ کھتری لڑکیوں کی برہمن لڑکوں سے شادی ہوئی لیکن برہمن لڑکیوں کی کھتری لڑکوں سے شادی کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی۔

ذات پات کے نظام کی خصوصیتیں:

ہندو سماج جب کہ وہ ذات پات کے سماجی فلسفے کے زیرِ اثر تھا اُس وقت اس نظام

کی چند مخصوص خصوصیتیں سامنے آتی ہیں:

1: سماج کی واضح حصّوں میں تقسیم: جس کی بنا پر ذات کی رُکنیت میں انتخاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ پیدایش کی بنا پر ذات کا تعیّن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دولت، تعلیم وغیرہ سے افراد کی سماجی پوزیشن کا اندازہ نہیں لگایا جاتا بلکہ اس ذات سے جس کا وہ رُکن ہے۔

ذات پات کی انتظامی تنظیم کو پنچایت کہا جاتا ہے جس کے ذمّے ان تمام امور کی دیکھ بھال ہوتی ہے جو ذات پات کے نظام کو کھوکھلا کر دیتے ہیں مثلاً اپنے سے کمتر ذات کے لوگوں سے میل ملاپ رکھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، دوسرے ذات کی عورت سے ناجائز تعلّقات رکھنا، شادی کا وعدہ پورا نہ کرنا، لڑکی بالغ ہونے کے بعد اس کو شوہر کے پاس بھجوانے سے پہلو تہی کرنا، بیوی کی ذمّہ داریوں کو فراموش کر دینا، قرض ادا نہ کرنا، دوسروں کی توہین کرنا، گائے کو یا دوسرے کسی دوسرے جانور کو مار ڈالنا جس کی ممانعت کی گئی ہے، برہمن کی توہین کرنا۔ اس لحاظ سے ذات ایک ایسا گروہ ہے جس سے انصاف کی اُمّید کی جاسکتی ہے۔

2: ذات پات کے نظام کی وجہ سے گروہوں کی درجہ بندی ممکن ہے۔ برہمن کا مرتبہ سب سے اُونچا ہوتا ہے جس کی برتری اور عظمت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں کوئی تین ہزار سے اُوپر ذیلی ذاتیں پائی جاتی ہیں لیکن سب سے مقدم برہمن ہیں۔

3: کھانے پینے اور سماجی میل جول پر پابندی۔ اس سلسلے میں کافی سخت قاعدے ہیں جن کی ... بر بظاہر ہوتا ہے کس ذات کا آدمی کس ذات کے پاس سے کس قسم کا کھانا قبول کر سکتا ہے؛ تمام کھانوں کی تقسیم دو طرح پر کی جاتی ہے (1) کچّا کھانا (2) پکّا کھانا۔ وہ تمام کھانے جن کی تیّاری میں پانی استعمال کیا جاتا ہے "وہ کچّا کھانا" کہلاتا ہے اور وہ تمام کھانے جن کی تیّاری میں گھی استعمال کیا جاتا ہے ان کا شمار "پکّا کھانے" میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کچّا کھانا کمتر ذات کے لوگوں سے قبول نہیں کیا جاتا بلکہ مساوی ذات کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کا "کچّا کھانا" استعمال کر سکتے ہیں، لیکن برہمن اگر کسی کو "کچّا کھانا" دے تو اس کو قبول کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

بعض صورتوں میں برہمن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھی نہیں کھاتے کیونکہ ان میں سے کچھ گوشت کھاتے ہیں اور کچھ محض ترکاریوں پر قناعت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیری برہمن گائے کے گوشت کے علاوہ دوسرا تمام گوشت خوشی سے کھاتے ہیں۔ بنگالی برہمن ترکاریت کے قائل ہوتے ہوئے بھی مچھلی خوشی سے کھاتے ہیں لیکن گجراتی برہمن مچھلی تو بڑی بات ہے انڈہ بھی

نہیں کھاتے۔ظاہر ہے کہ جب مختلف مقامات کے رہنے والے برہمنوں کے خیالات گوشت اور ترکاری سے متعلق اتنے مختلف ہوں تو وہ کس طرح آپس میں شادی بیاہ کا رشتہ جوڑ سکتے ہیں۔

ذات پات کے نظام کی سب سے واضح خصوصیت چھوت چھات کا طریقہ ہے۔شودر ذات کو اتنا نیچ اور ملیچھ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے کوئی پانی نہیں پیتا اور جن کے چھونے سے گنگا جل ناپاک ہوجاتا ہے لہٰذا ان سے کسی قسم کا ربط نہ رکھا جائے کیونکہ وہ اچھوت یا untouch- ables ہیں۔اچھوت پن کی بدترین نوعیت یہ تھی کہ شودروں کو باؤلی سے پانی لینے کی اجازت نہیں تھی۔وہ مندر میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ان لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ گانو کے باہر رہیں کیونکہ کمتر ذات کے لوگوں کو محض چھو لینے سے نجاست کے پھیلنے کا امکان لگا رہتا تھا۔ان کا سایہ اگر کسی برہمن پر پڑ جائے تو وہ نجس ہوجاتا تھا۔حیرت کی تو یہ بات ہے کہ بعض علاقوں میں اسی امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ برہمن اور شودر میں چوبیس قدموں کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ایک نائر (Nayar) نمبودری (Numbudiri) برہمن کے قریب جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ برہمن کو چھونے کا خیال نہ کرے۔جب کہ تایان (Tiyan) اور برہمن کے درمیان 96 قدموں کا فاصلہ ضروری تھا۔اچھوت پن کی ایسی بھی مثالوں کا حوالہ ہندوستانی سماجیات کے ماہروں نے دیا ہے کہ جب کہ ایک برہمن ڈاکٹر نے شودر مریض کی کلائی پر ایک چھوٹا سا سلک کا کپڑا لپیٹ دیا تاکہ شودر کو چھونے سے برہمن ڈاکٹر نجس نہ ہو جائے۔

غرض نیچ ذات کے افراد اونچی ذات کے افراد کے نزدیک

untouchable

unapproachable

unseeable

سمجھے جاتے ہیں جن کو چھونے، ان کے قریب جانے اور ان کو دیکھنے سے برہمن نجس ہو جاتے ہیں۔

4 : شہری اور مذہبی حقوق سے محرومی: نیچی ذات کے افراد اونچی ذات کے افراد کے ہاتھوں اس قدر ناانصافیوں کا شکار ہوئے کہ انھیں گانو سے باہر رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ان کے محلّوں کے خاص نام ہوتے تھے اور انھیں اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ تمام شہریوں کی طرح سب سے مل جل کر رہیں۔جنوبی ہندوستان کے بعض قصبے اور دیہات ایسے تھے جہاں پر نیچی ذات کے

لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ٹراونکور میں مہار (Mahars) اور منگس (Mangs) کو صبح نو بجے سے دوپہر میں تین بجے تک شہر کی گیٹ سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ نو بجے سے پہلے اور تین بجے کے بعد سایہ لمبا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے اگر یہ سایہ برہمن پر پڑ جائے تو وہ نجس ہو جائے گا۔

تمام ہندوستان میں اس اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی کہ جن باؤلیوں سے برہمن پانی لیتے ہیں۔ ان باؤلیوں سے شودروں کو پانی نہ دیا جائے۔

ہندوستان کے بعض حصّوں میں مہار ذات کے لوگوں کو زمین پر تھوکنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ بے خیالی میں اگر کسی برہمن کا پاؤں اس پر پڑ جائے وہ نجس ہو جائے گا اس لیے وہ اپنی گردن میں ایک مٹّی کا کونڈا لٹکائے پھرتے تھے۔ انھیں اپنے ساتھ ایک جھاڑو بھی رکھنی پڑتی تھی تاکہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے جائیں جھاڑو سے اپنے قدموں کے نشان مٹاتے جائیں۔ اگر ان کے سامنے سے کوئی برہمن گزرے تو ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ برہمن کے سامنے زمین پر لیٹ جائے تاکہ اس کا منحوس سایہ مقدّس برہمن کو نجس نہ کر دے۔ پنجاب میں گو دوسرے مقامات کے مقابلے میں اس قسم کی پابندیاں کم تھیں مگر ایک خاکروب سے یہ توقّع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی بغل میں جھاڑو کا کٹھ دبائے رہے اور ہر تھوڑی دُور پر آواز لگاتا جائے تاکہ لوگ اس کے نجس سایے سے محفوظ رہ سکیں۔

تمام سرکاری اسکولوں میں چمار (Chamars) اور مہار (Mahars) کا داخلہ ممنوع تھا۔ اگر کوئی باہمت اسکول میں شریک بھی ہو جائے تو استاد اور ہم جماعت اس کو اس قدر تنگ کرتے کہ وہ اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔

نیچ ذات کے لوگوں کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا کہ گھر کی تعمیر میں وہ کون سا سامان استعمال کر سکتے ہیں۔ انھیں دو منزلہ مکان بنانے کی اجازت نہیں تھی۔

ملابار کے مشرقی ساحل پر نیچ ذات کے لوگوں کو چھتری ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ چپّل نہیں پہن سکتے تھے۔ سونے کے زیور نہیں بنا سکتے تھے اور نہ گائے کا دودھ نکال سکتے تھے۔ صرف اُونچی ذات کے لوگ چبوتروں پر بیٹھ سکتے تھے اور اگر کوئی برہمن کے سامنے اس جگہ پر بیٹھ جائے تو پھر اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ برہمن کے علاوہ تمام دوسری ذات کے لوگوں کو جسم کا بالائی حصّہ ڈھانکنے کی اجازت نہیں تھی۔

مدراس میں ایک عرصے تک غیر برہمنوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا تھا

1 : سیدھے بازو کی ذات Right-hand Caste

2 : بائیں بازو کی ذات Left-hand Caste

سیدھے بازو کی ذات کو چند مراعات حاصل تھیں جو انھوں نے بائیں بازو کی ذات کو دینے سے انکار کیا مثلاً گھوڑوں پر بیٹھ کر جلوس نکالنا اور شادی کے لیے بارہ ستون کا پنڈال (booth) بنانا۔ انھیں صرف گیارہ ستون کا پنڈال بنانے کی اجازت تھی۔

شودروں کو مقدّس کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ برہمن پُجاری کے علاوہ کسی دوسرے پُجاری سے مذہبی فرائض انجام نہیں دیے جاسکتے تھے۔ انھیں مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ خاص صورتوں میں مندر کے صحن یا پچھواڑے میں ٹھہر سکتے تھے۔ جنوبی ملابار میں تو اونچی ذات کے لوگوں نے نیچی ذات کے مردوں کو دفن کیے جانے سے بھی منع کیا۔

برہمن کسی کے سامنے نہیں جُھکتا بلکہ وہ توقع کرتا ہے کہ دوسرے تمام اس کے آگے اپنا سر تسلیم خم کریں گے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی یہ حد تھی کہ جب تک برہمن اپنا پانو پینے کے پانی میں نہیں ڈبوتا اس پانی کو پیے بغیر نیچ ذات کے لوگ کھانا شروع نہیں کرتے تھے۔

خود حکومت کا رویہ بھی برہمنوں سے مختلف تھا۔ برہمنوں کی زمینوں پر بہت کم ٹیکس لگایا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی قصور کے مرتکب ہو جائیں تو ان کو سزا دینے میں بہت زیادہ رعائتیں کی جاتی تھیں۔

5 : پیشوں پر پابندی : افراد کو کبھی اس بات کی آزادی نہیں تھی کہ وہ اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کریں، چاہے ان کا میلان دوسرے پیشے کی طرف کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو لہٰذا برہمن یہ بالکل صحیح سمجھتے تھے کہ وہ پُجاری کے فرائض انجام دیں اور چمار اس میں خوش تھا کہ اس کا کام چمڑا صاف کرنا اور جوتے سینا ہے۔ اس لحاظ سے لوگوں پر ایک عوامی اور اخلاقی دباؤ رہتا تھا کہ ان کا جو بھی پیشہ خاندانی ہے اس کو جاری رکھیں۔

6 : شادی بیاہ پر پابندی : شادی بیاہ کا صرف چار اہم ذاتوں کے اندر ہونا ہی ضروری نہیں تھا بلکہ ذیلی ذاتیں بھی اپنی ذات کو پاک اور پوتر رکھنے کے لیے اپنی ذات سے باہر شادی

ہونے کو معیوب سمجھتی تھیں۔ اس طرح سے درون گروہ شادی (endagamy) کی اس قدر پابندی کی جاتی تھی کہ اسے ذات پات کے نظام کا ایک اہم جز و سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ایسی صورتیں ضرور نظر آتی ہیں جب کہ بڑی ذات کے لڑکے نے چھوٹی ذات کی لڑکی سے بیاہ کیا لیکن بڑی ذات کی لڑکی کا چھوٹی ذات کے لڑکے سے بیاہ کرنا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جب اس اصول سے انحراف کیا جاتا تھا تو اس کا نتیجہ "ذات باہر" ہونے کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ اس لیے ہر ذیلی ذات اپنے سے متعلقہ ذات کے لوگوں سے سماجی روابط قایم رکھتا تھا اور دوسری ذاتوں سے میل ملاپ کے بغیر ان کی زندگی کے کاروبار آزادانہ طور پر چلتے رہتے تھے۔

مختصر یہ کہ تقریباً دوسو ایسے سماجی گروہ ہیں جنھیں ذات کہا جاتا ہے اور جو مخصوص لسانی رقبوں میں رہتے ہیں۔ ان کے مخصوص نام ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت کا تعین پیدائش پر ہوتا ہے۔ ان دوسو لسانی گروہوں کی ہزاروں ذیلی ذاتوں میں تقسیم ہوتی ہے جن کے درمیان شادی بیاہ، کھانے پینے پر پابندیاں ہوتیں۔ اور یہ روایتی سماجی ورثے کے حصہ دار ہوتے ہیں۔

ذات پات کا نظام اور سماجی تبدیلی:

ہندو سماج کی سب سے بالائی منزل پر برہمن براجمان ہیں اور ان میں رسم و رواج، کھانے پینے کے طریقوں اور سماجی معیار کی حد تک کافی فرق نظر آتا ہے۔ برہمن ذات میں سب سے نمایاں کیرالا کے نمبودری برہمن، مہاراشٹر کے چِٹپاون (Chitpavan)، مدراس کے آئر اور آئنگار اور کشمیر کے کشمیری برہمن ہیں۔ سماجی زندگی کے دو اہم اداروں یعنی مذہب اور تعلیم پر ہمیشہ ان کا تسلط رہا۔

ہندو آبادی کا تقریباً 4 ، 6 فیصد حصہ برہمنوں پر مشتمل ہے جو جغرافیائی اعتبار سے غیر مساوی طور پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جنوب کے مقابلے میں شمال میں بالخصوص اترپردیش اور پنجاب میں زیادہ تر برہمن بستے ہیں۔

ہندوستان میں جب انگریز داخل ہوئے تو ان کا ربط زیادہ تر برہمنوں سے رہا لہٰذا انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے والوں میں برہمن سب سے پہلے ہیں۔ اس لحاظ سے سرکاری نوکریوں میں بھی برہمنوں کا تناسب زیادہ ہے۔ لیکن مخالف برہمن (anti-Brahman) جذبوں کے پرورش پانے کی وجہ سے برہمنوں کا پوزیشن نازک ہوگیا ہے اور خصوصاً جب گاندھی جی کا قتل ایک برہمن

کے ہاتھوں ہوا تو لوگوں میں برہمنوں کے خلاف اور بھی زیادہ آگ بھڑک اُٹھی۔

ہندو سماج کی سب سے نچلی منزل "اچھوت" بیٹھے ہوئے اپنی شومیٔ قسمت پر آنسو بہاتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں انھیں درج فہرست ذاتیں (scheduled Castes) قرار دے کر انھیں کئی رعایتیں دی گئیں کیونکہ برس ہا برس تک ان کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر (Dr. B.R. Ambedkar) نے اپنی سوانح حیات میں ان تمام ناانصافیوں اور بدسلوکیوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ذات سے تعلق رکھنے والے افراد، ان کے خاندان اور خود ان کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔

ہندوستان میں لگ بھگ 60 میلین اچھوت ہیں گو ان کی آبادی اس سے زیادہ نظر آتی ہے اس لیے شماریات کے ماہرین کا خیال ہے کہ آبادی کا تقریباً بیس فیصد حصہ نیچ ذات سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں کی سماجی زندگی میں جو تبدیلی لہرآئی ہے وہ دراصل گاندھی جی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مغرب کے اثرات کی وجہ سے مساوات کا تصوّر عام ہوا، لیکن اسی مسئلے پر توجّہ دلانے میں گاندھی جی کا نمایاں حصّہ ہے جنھوں نے ایک اچھوت بچّی کو اپنے گھر میں رکھا اور اچھوتوں کو باوقار نام "ہریجن" دیا جس کے معنی ہیں "خدا کے بچّے"۔ گاندھی جی نے "تعمیری پروگرام" (Constructive program) کے ذریعے عوام کو اس ذات کی گری ہوئی سماجی اور معاشی زندگی سے واقف کرایا اور ہریجنوں کی بہبودی کے لیے "ہریجن" نام کا ایک رسالہ باضابطہ شایع کروانا شروع کیا۔ انھوں نے 1932ء میں حکومت کی توجّہ اس سنگین مسئلے پر مبذول کروانے کے لیے "مرن برت" رکھا۔ اور قانون ساز مجلس میں ان کی نمائندگی پر زور دیا۔ 1950ء میں ہندوستانی دستور نے اچھوتپن کو منسوخ کیا۔ چنانچہ ہندوستانی دستور کا ۱۷واں فقرہ ہے

> "Untouchability is abolished and its practice in any form is forbidden."

یعنی "اچھوت پن کو ختم کیا جاتا ہے اور اس پر عمل چاہے کسی صورت میں ہو ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔"

دستور کے فقرہ نمبر پندرہ کے مطابق تمام امتیازات کو جو دوکانوں، ہوٹلوں، اقامت خانوں اور تفریحی مقاموں میں داخلے سے متعلق تھے ختم کر دیا گیا۔ انھیں باؤلیوں سے پانی لینے ،

سڑکوں پر گھومنے پھرنے، مذہبی گھاٹوں پر جانے کی اجازت دی گئی۔ اور فقرہ نمبر 29 کے مطابق ہر وہ تعلیمی ادارہ جو حکومت سے رقمی امداد لیتا ہے وہ ہریجن کے بچوں کو داخلہ دینے سے انکار نہیں کرسکتا۔ سنہ 1955ء میں Untouchability offence Act نافذ کیا گیا جس کی رو سے امتیازات سزا کے مستحق قرار پائے۔ غرض اچھوت کو غیر دستوری اور اصولی طور پر ناجائز قرار دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ موجودہ زمانے میں ذات پات کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ مغربی تعلیم، یورپی تہذیب، آمد و رفت کی سہولتوں، وظیفوں کی اجرائی، مُفت تعلیم، اقامت خانوں میں مُفت ٹھہرنے کے انتظام، فنی اور پیشہ ورانہ اداروں میں نشستوں کے محفوظ رکھنے اور ہر محکمے میں ان کی شمولیت پر زور دینے کے لیے ان کو ترجیح دینے کا رُجحان اور مساوات کے تصوّر کی وجہ سے آج بعض اچھوت مرکزی اور اسٹیٹ گورنمنٹ کے اعلا عہدوں پر بھی نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، آرکیٹکٹ اور پروفیسر عہدہ داروں کی کُرسی پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بھی تعداد کے مقابلے میں اتنے کم افراد موقعوں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں کہ اب عوام میں یہ بے چینی کا احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ہریجنوں کے لیے نشستیں محفوظ کرنے کے طریقے کی وجہ سے کئی قابل اور ہُنرمند لوگ جن کا تعلیمی معیار ہریجنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے وہ حق تلفی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت ہر ممکنہ طور پر مختلف ترغیبوں کے ذریعے ہریجنوں کو معاشی اور سماجی پستی سے نکالنا چاہتی ہے لیکن جب تک خود ان کے دل اور دماغ میں برتری اور کمتری کے خیالات رہیں گے اس وقت تک کوئی سرکاری پروگرام کامیاب نہیں ہو سکتا، اس لیے عام بیداری کی ضرورت ہے تاکہ شعور جاگ اُٹھے۔

فہرست کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا۔

1 - Bierstedt, R: "The Social Order." p.351.
2 - Dresslar, D: "Sociology." p.365.
3 - Ibid. p.210
4 - Ibid. p.210
5 - Ibid. p.213.
6 - Ibid. p.221
7 - Ibid. p.224
8 - Ibid. p.224
9 - Ibid. p.370
10 - Lamb, B.P: "India - A world in Transition" p.136.
11 - Ghurye, G.S: "Castes & Class in India." p.155.
12 - Bottomore, T.B: "Society." p.158-203
13 - Tumin, M.M: "Social Stratification."
14 - Constitution of India.
15 - Marx, M. Engles, F: "Communist Manifesto."
16 - Hutton, J.H: "Caste in India."
17 - Panikkar, K.M: "Hindu Society at Crossroads."
18 - Dube, S.C: "Indian Village."
19 - Srinivas, M.N: "Caste."

چھٹا باب

سماجی بین عمل اور سماجی طریق

(SOCIAL INTERACTION & SOCIAL PROCESSES)

سماج کے سائنسی مطالعے کے لیے سماج کی ساخت اور فعلیت پر غور کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک ساخت یا Structure کا تعلق ہے گروہ، کلچر اور سماجی ادارے زیر بحث آتے ہیں اور فعلیت پر روشنی ڈالنے کے لیے سماجی تعلّقات کے ترکیباتی پہلو یعنی dynamic aspect کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ سماجی طریق کا مطالعہ سماجی تعلّقات کے فعلیاتی پہلو (functional aspect) کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

سماجیات کے ماہر سماجی تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے اور سماجی تعلّقات کے اثباتی (Positive) اور منفی (negative) پہلو کو واضح کرنے کے لیے سماجی طریق پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق سماجیات کا مطالعہ اسی وقت سائنسی بنیادوں پر ممکن ہے جب کہ سماجی ساخت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ سماجی بین عمل کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے کیونکہ سماجی طریق کی وجہ سے سماج کی ترکیباتی تصویر سامنے آتی ہے۔ ایک زندہ سماج کی علامت ہی یہ ہے کہ اس میں وقفے وقفے سے تبدیلیاں آتی ہیں جو ساخت اور فعلیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماجی تعلّقات انتہائی مستحکم اور پائیدار ہوتے ہیں اور سماجی ساخت کی نوعیت بدل نہیں سکتی، لیکن تبدیلی قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دیر سویر ہی کیوں نہ ہو سماجی تعلّقات تبدیلیوں کے زیرِ اثر آتے ہیں۔ سماجی طریق کی مدد سے جماعتوں کی تشکیل، تعلّقاتی نظام اور سماجی ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب ایک مخصوص نظامِ زندگی میں تبدیلیاں آتی ہیں تو ان تبدیلیوں

کو افراد کس طرح قبول کرتے ہیں؟ ان کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے؟ غرض سماج کا ترکیباتی پہلو افراد اور جماعتوں کے بین عمل پر مشتمل ہے اور سماجی طریق سماجی بین عمل کے مختلف روپ (Phases) ہیں۔ چنانچہ گلن اینڈ گلن (Gillin and Gillin) کے الفاظ ہیں:

"By social processes we mean those ways of interacting which we can observe when individuals and groups meet and establish system of relationships, or what happens when changes disturb already existing modes of life."

یعنی "سماجی طریق سے ہماری مراد بین عمل کے ایسے طریقے ہیں جو افراد اور گروہوں کے میل ملاپ کے دوران اور تعلقاتی نظام کے قائم ہوتے وقت نظر آتے ہیں یا پہلے سے قائم شدہ طریقۂ زندگی میں تبدیلیوں کی وجہ سے کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

اس تشریح سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب بھی سماجیات کے ماہر سماجی طریق پر بحث کرتے ہیں تو ان کا اشارہ سماجی بین عمل کے مختلف طریقوں یا شکلوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سماجی طریق انسان کے طرز عمل اور طرز برتاؤ پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک زمانے تک امریکی سماجیات داں سماجیاتی تجزیے کے لیے سماجی طریق کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ امریکی سماجیاتی ادب میں اس موضوع پر لکھی ہوئی پارک اور برجیس (Park and Burgess) کی کتاب "An Introduction to the Science of Sociology" سماجی طریق کو سمجھنے میں بجا طور پر مشہور ہوئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سماجیات سے دلچسپی رکھنے والے ہزاروں افراد نے بنیادی سماجی طـــریق کی حیثیت سے تعاون (Co-operation)، مقابلہ (Competition)، تطابق (Accomodation)، انجذاب (Assimilation) اور تصادم (Conflict) کا مطالعہ شروع کیا۔ ان تمام سماجیاتی تحقیقوں اور تجزیوں سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ جس طرح سے سماج ترتیب پاتا ہے وہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ سماج کی بازتنظیم یعنی (re-organisation) ضروری ہے۔ اس خیال کے حامی مفکروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مختلف سماجی طریق کی وجہ سے سماجی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جو ایک

حرکیاتی سماج کے لیے بدیہی ہیں چارلس ہرٹن کولی (Charles Horton Cooley) جس کا نام امریکہ میں سماجیات کی داغ بیل ڈالنے والوں میں کافی مشہور ہے اس نے چارلس ڈارون (Charles Darwin) کی تصنیفوں کے مطالعے کے بعد سنہ 1918ء میں "Social Processes" کے موضوع پر ایک کتاب شایع کی جس میں انھوں نے قدرتی انتخاب اور مطابقت یعنی natural selection and adaptation کے اصول کو سماجی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سماجیاتی ادب میں ایسا رجحان پیدا ہوا جو سماجی طریق کو مسلسل تبدیلی اور نشو ونما سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس طرح سماجی طریق کا تصور سماجیاتی نقطۂ نظر کا بنیادی پہلو ہے۔ مختصر یہ کہ سماجی طریق سے سماجی بین عمل کی مختلف شکلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ سماجیات کے مشہور مفکر البیون وڈبری اسمال (Albion Woodbury Small) کا کہنا ہے کہ

"Social process is a collection of occurances, each of which has a meaning for every other."

یعنی "سماجی طریق واقعات کا مجموعہ ہے جس کا ہر واقعہ ایک دوسرے کے لیے بامعنی ہوتا ہے"۔
سماجی طریق ہمیشہ چند مخصوص انسانی مفادوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

افراد اور گروہ کا وجود ایک دوسرے کا رہین منت ہے۔ نہ تو افراد کا تصور گروہ کے بغیر ممکن ہے اور نہ گروہ کا وجود افراد کے بغیر۔ یہ ضرور ہے کہ گروہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی گروہ چھوٹا تو کوئی بڑا، کوئی سادہ تو کوئی پیچیدہ۔ لیکن ہر صورت میں افراد کی وابستگی گروہ کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض افراد کی وابستگی مخصوص گروہوں سے ہو اور تمام گروہوں کے ساتھ وہ یکساں طور پر اشتراک عمل نہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر افراد دو یا تین گروہوں کے رکن ہوتے ہیں اور بقیہ سے یا تو ان کی وابستگی ہوتی ہی نہیں یا اگر وہ وابستہ بھی رہیں تو برائے نام۔ بہرحال افراد چاہے کئی گروہوں کے رکن ہوں یا چند گروہوں کے ان کا طرز عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ "ego" کے جذبے سے متاثر ہو کر کئی سماجی کام انجام دیتے ہیں اور بعض افعال میں ان کی یہ خواہش مضمر ہوتی ہے کہ سماج کے مروجہ اور مسلمہ معیاروں کو اپنائیں۔ اگر ہم فرائڈ (Freud) کی اصطلاح کے ذریعے ان افعال کی تشریح کریں تو جبلت پر مبنی افعال میں "ID" کا محرک کارفرما رہتا ہے اور دوسری نوعیت کے افعال میں درکائم (Durkheim) کے نظریۂ اجتماعی نیابت (Collective Representation)، میڈ (Mead) کے نظریۂ "Me" اور فرائڈ کے نظریۂ

"ego – super" کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ انسانی افعال کا دوئی پن ہے کہ وہ کبھی جذبات اور خواہشات کی رو میں بہہ کر کوئی خاص فعل کا مرتکب ہوتا ہے تو کبھی عقل اور استدلال سے کام لے کر منطقی نتیجہ اخذ کرتا ہے جس کی وجہ سے سماجی تبدیلی، سماجی کنٹرول، سماجیت اور سماجی طریق کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ جارج سمل (George Simmel) انسانی افعال کے اسی دوئی پن کو تمام ارتباطی (Associative) اور غیر ارتباطی (Dis-Sociative) تعلقات کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ مشترک رجحانوں، مشترک قدروں اور مشترک احساسوں سے فرد کی وابستگی ارتباطی طریق میں ظاہر ہوتی ہے جس کی بنیاد تطابق، انجذاب اور تعاون پر قایم ہے۔ غیر ارتباطی طریق کا نتیجہ تصادم، تناؤ اور کھنچاؤ اور مقابلے میں ظاہر ہوتا ہے۔

سماجی بین عمل : SOCIAL INTERACTION

سماجی طریق کی سب سے بنیادی شکل سماجی بین عمل ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی سماجی فعل سماجی بین عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ پارک اور برجیس (Park & Burgess) کے الفاظ میں:

"If there is no interaction there is no awareness, no understanding, in fact, no mental life or social life or growth."

یعنی "اگر بین عمل نہ ہو تو نہ آگاہی ہو سکتی ہے، نہ سمجھنے کی ضرورت، لہٰذا نہ تو ذہنی زندگی ممکن ہے، نہ سماجی اور نہ کسی قسم کی نشو ونما۔"

لہٰذا گلن اینڈ گلن کے خیال کے مطابق

"By social interaction eve refer to social relations of all sorts in function– dynamic social relations of all kinds–whether such relations exist between individual & individual, between group and group or between group and individual, as the case may be..

> "سماجی بین عمل تمام حرکیاتی سماجی تعلقات کی نشاندہی کرتا ہے۔ خواہ یہ تعلقات افراد کے درمیان ہوں، دو گروہوں کے مابین پائے جائیں یا گروہ اور فرد کے درمیان ہوں۔ بہرحال جو بھی صورت ہو۔"

دوسرے الفاظ میں دو یا دو سے زیادہ افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے کی توقعات کے مطابق عمل کرنا سماجی بین عمل کہلاتا ہے۔

سماجی بین عمل کا طریق بالکل ابتدائی نوعیت کا حامل ہے جس کی تصدیق روزمرّہ کے برتاؤ سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر افراد کا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا مصافحہ کرنا، گلے لگانا، سلام اور کلام سماجی تعلّقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اکثر صورتوں میں تو الفاظ کے استعمال یا بات چیت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی بلکہ مختلف حرکات و سکنات، اشاروں اور آوازوں کے ذریعے ایک دوسرے کے خیالوں، رُجحانوں اور احساسوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کی طرف خود سے ہاتھ بڑھانا یا خاموش کھڑے رہنا، کسی کو دیکھ کر انجان ہو جانا یا ایک دم آگے بڑھنا، کسی کی طرف محبّت سے آگے بڑھنا یا غصّے سے آگ بگولہ ہو جانا، آنکھوں کو اس طرح پھیرنا کہ اس سے لاگ یا لگاؤ کا پتہ چل جائے، شانوں اور آبروؤں کا اس طرح اُتار چڑھاؤ کہ اس سے حیرت اور استعجاب کا اظہار ہو، سر کو اس طرح جنبش دینا کہ اس سے کسی فعل کو جاری رکھنے یا روک دینے کا احساس ہو۔ غرض افراد مختلف جسمانی اعضاء کو حرکت دے کر اکثر و بیشتر صورتوں میں اپنے معنی مطلب کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔

حرکات و سکنات کے علاوہ مختلف آوازوں سے بھی جذبات کا اظہار ہوتا ہے مثلاً چیخیں مار کر کسی کو دہلا دینا، خوف زدہ کر دینا، خطرہ سے آگاہ کرنا، صدمے کا اظہار کرنا وغیرہ۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے سماجی بین عمل کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک غیر لفظی یعنی non - verbal اور دوسری لفظی یعنی verbal۔ غیر لفظی ذریعے بھی اتنے ہی موثر ثابت ہوتے ہیں جتنے کہ لفظی۔ غیر لفظی علامتیں (non-verbal symbols) سنسناری نوعیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ زبان کی عدم واقفیت کے باوجود ہر کس و ناکس ہر مقام پر مختلف حرکتوں، اشاروں اور آوازوں کے ذریعے اپنے خیالوں اور احساسوں کا اظہار اکثر و بیشتر صورتوں میں مکمّل طور پر کر لیتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہر ملک اور سماج میں ان کے معنی یکساں نہیں لیے جاتے بلکہ مختلف سماجوں میں مختلف حرکتوں اور اشاروں کو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں سے پھر بھی ایسی کافی

علامتیں، حرکتیں اور اشارے ہوتے ہیں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت آفاقی (universal) ہوتی ہے۔ مثلاً ہاتھ کے اشارے سے کسی کو اپنی طرف بلانا یا روک دینا۔ سر کو اس طرح جنبش دینا کہ اس سے "ہاں" یا "نہیں" کا اظہار ہو اور چیخ کر دہلا دینا۔ ان مختلف مثالوں سے ظاہر ہے کہ بعض حرکات و سکنات آفاقی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض مقامی جس کی بنا پر مختلف تمدنوں میں پرورش پانے والے افراد ان حرکتوں کی مختلف توجیہہ کرتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض ملکوں میں حرکات و سکنات کے ذریعے زیادہ تر خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور بعض ملکوں میں کم مثلاً برطانیہ اور سویڈن کے باشندوں کے مقابلے میں اٹلی اور مشرقی یورپ اور شمالی ہندوستان کے مقابلے میں جنوبی ہندوستان میں اظہار خیال کے لیے الفاظ سے زیادہ حرکتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فن کے مخصوص شعبوں میں جسمانی حرکتوں اور اشاروں کے ذریعے خیالوں، جذبوں اور احساسوں کی ترجمانی کے لیے خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی ہے جیسے اداکاری اور رقاصی۔ کامیاب اداکار اور رقاص وہی سمجھا جاتا ہے جو حرکتوں اور اشاروں کے ذریعے اپنے خیالوں اور احساسوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم کے مختلف حصّوں کو اس طرح حرکت دیتا ہے کہ دیکھنے والوں پر ساحرانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی معنی خیز نگاہیں اور چہرے کے تاثرات اندرونی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دیکھنے والے اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر الفاظ کا استعمال بے معنی ہوتا ہے۔

جارج ہربرٹ میڈ (George Herbert Mead) نے جو کتاب "Mind, self & society" پر لکھی ہے اس میں انھوں نے ترسیل (Communication) کے اس ذریعے پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اہم علامتوں (Significant symbols) اور فطری اشاروں (natural signs) میں فرق کیا ہے۔ میڈ کے لحاظ سے اہم علامتوں کا دار و مدار اکتساب یا learning پر ہوتا ہے جس میں کوششوں اور ارادہ کا دخل ہوتا ہے جب کہ فطری اشاروں میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

سماجی بین عمل کی اساس: BASIS OF SOCIAL INTERACTION

سماجی تعلقات کی اساس سماجی بین عمل پر ہوتی ہے جس کے لیے ان دو باتوں کا ہونا ضروری ہے:

1: سماجی ربط یا Social Contact

2: ترسیل یا Communication

لفظ Contact کا ماخذ لاطینی ہے جس کے معنی انگریزی میں "touch together" کے ہیں۔ اگر ہم کسی مادہ کی ماہیت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو چھونا ضروری ہے لیکن سماجی حالتوں میں انسان کے احساسوں اور جذبوں کا اندازہ لگانے کے لیے چھونا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ الفاظ، اشارے اور حرکتیں موثر ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ رسل و رسائل کے مختلف ذریعوں جیسے ٹیلیفون، ٹیلیگرام، پوسٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ سے خبریں بڑی آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ اس تمدنی ورثے (Cultural Heritage) میں انسان نے اپنی فنی معلومات، تحقیق اور تجسس سے کافی اضافہ کیا ہے جس کی بدولت سماجی ربط قایم رکھنے میں فاصلے کی طوالت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

سماجی بین عمل کی سب سے اوّلین شرط "سماجی ربط" ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں لفظ "ربط" کسی فرد یا گروہ سے تعلق قایم کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس کی بنا پر کسی فرد یا گروہ سے واقفیت عاید ہوتی ہے۔ تمام کاروبار کا دار و مدار ربط پر قایم ہے اور وہی فرد یا گروہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جس کے میل ملاپ کا دائرہ وسیع ہو۔

سماجی ربط کے لیے جسمانی ربط ضروری نہیں ہے۔ پھر بھی جسمانی ربط کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جسمانی ربط سماجی بین عمل کے لیے زبردست محرک ثابت ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ افراد جب بھی اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب سے ملتے ہیں تو وہ اپنی یگانگت اور وابستگی کا اظہار سماج کے مروّجہ طریقوں کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ کسی سماج میں، ایک دوسرے کے پیر دھوکر وابستگی کا اظہار کیا جاتا ہے تو کسی سماج میں ایک دوسرے کی ناک رگڑ کر، کسی سماج میں سلام علیکم ہوتا ہے تو کسی کے ہاں بغل گیر ہونے کا رواج ہے۔ بہر حال ہر سماج میں "touch system" کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا ہے اور متعلقہ افراد کا ان طریقوں سے انحراف یا گریز سماجی بین عمل کی نفی کرتا ہے۔ سماج کے ان مروّجہ طریقوں کی طرف سے لاپروائی کا رجحان افراد کو اس تذبذب میں ڈال دیتا ہے کہ مستقبل میں متعلقہ فرد سے مستحکم تعلقات کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ یہی وہ حالات ہوتے ہیں جو سماجی بین عمل کے دائرہ کو تنگ کر دیتے ہیں۔

سماجی بین عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس کی توقع کے مطابق جواب یا response ملتا رہے۔ اس طرح سماجی ربط سے متعلق دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت تو اثباتی یا Positive ہوگی اور دوسری منفی یا Negative۔ اثباتی سماجی ربط کی نوعیت ترکیباتی ہوتی ہے جس کا نتیجہ ارتباطی سماجی ربط یا Associative social Contact میں ظاہر ہوتا ہے جو تمام خوشگوار اور صحت مند تعلقات کی اساس ہے۔ ان تعلقات کا انحصار تعاون، سمجھوتے، رواداری اور ایک دوسرے سے گھُل مل کر زندگی گزارنے کے رُجحان پر مبنی ہوتا ہے۔

منفی سماجی ربط یا تو غیر ارتباطی بین عمل (Dissociative Interaction) میں ظاہر ہوتا ہے یا پھر افراد کے مابین عمل ہونے ہی نہیں پاتا۔ اس کی مثال وہ تمام بدنصیب شخصیتیں ہوتی ہیں جو اپنے طرزِ برتاؤ کے بھونڈے طریقوں سے اپنا رہا سہا اثر بھی کھو بیٹھتی ہیں یا ابتدا ہی سے کم قدری کا شکار ہو کر چند لمحاتی اثر بھی قایم نہیں رکھ سکتیں۔

مثبت اور منفی صورتوں کے علاوہ سماجی ربط کی مزید دو نوعیتوں پر بھی غور کرنا چاہیے۔

1: ابتدائی یا Primary

2: ثانوی یا Secondary

ابتدائی سماجی ربط میں فرد یا گروہ ایک دوسرے کے مدِمقابل یا روبرو (face to face) ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے پر براہِ راست اثر پڑسکتا ہے۔ اس قسم کے ربط میں فرد اور گروہ ایک دوسرے کو دیکھ کر اور ایک دوسرے کی گفتگو سُن کر کوئی رائے قایم کرسکتے ہیں جب کہ ثانوی سماجی ربط میں کسی دوسرے ذریعے یا agency کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ذریعہ کوئی فریق بھی ہوسکتا ہے یا تمدّن کا کوئی عنصر (element) مثلاً کسی فرد یا گروہ سے ٹیلیفون پر ربط قایم کرنے کی کوشش کرنا یا ٹیلیگرام یا خطوط کے ذریعے ربط قایم کرنے کی کوشش کرنا۔ سماجی ربط کے یہ ثانوی طریقے سماجی تعلقات پر کوئی خراب اثر نہیں ڈالتے گو ان کی نوعیت غیر شخصی ضرور ہوتی ہے۔

ثانوی سماجی ربط کی نوعیت براہِ راست بھی ہوسکتی ہے اور بالواسطہ بھی۔ براہِ راست ثانوی ربط میں تمدّن کے ان عناصر سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے جس کا راست اثر کسی حس پر پڑتا ہے۔ مثلاً ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود ٹیلیفون پر ایک دوسرے کی آواز کو بآسانی سُنا جاسکتا ہے۔ بالواسطہ ثانوی ربط میں کسی دوست یا جان پہچان والوں کی مدد ضروری ہوتی ہے

تاکہ وہ ایک دوسرے کا پیغام پہنچا سکیں۔

بہرحال سماجی ربط کی نوعیت چاہے ابتدائی ہو یا ثانوی، اثباتی ہو یا منفی، براہ راست ہو یا بالواسطہ اس کے نتیجے بہت دُور رس ہوتے ہیں کیونکہ ہر سماجی ربط میں انسانی احساسات اور جذبات پنہاں ہوتے ہیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے جس کی تشریح اور توضیح ممکن ہے جس سے سماجی بین عمل کے طریق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

سماجی بین عمل میں سماجی ربط کے علاوہ ترسیل یا Communication کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ترسیل کے ذریعے کسی فرد یا گروہ کے خیالوں، رُجحانوں اور ارادوں کو دوسرے فرد یا گروہ تک پہنچا کر اس کے جواب کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ترسیل کے دو ذریعے ہیں۔ ایک لفظی اور دوسرا غیر لفظی۔ اگرچہ کہ ترسیل کا موثر ذریعہ زبان ہے لیکن چہرے کے تاثرات، حرکات و سکنات، اشارے اور آوازیں غیر لفظی ترسیل کی بہترین مثالیں ہیں جن کے ذریعے انسانی تعلقات میں لاگ اور لگاؤ کی نشان دہی بآسانی کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر مُسکرانے پر غور کیجیے۔ مُسکراہٹ سے دوستی اور لگاؤ، ہمدردی اور تعاون کا بھی اظہار ہوتا ہے اور شماتت اور حقارت، طنز اور شکوک کی طرف بھی گمان گزر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی کو نظر بھر کر دیکھنے کی تشریح خلوص، محبّت اور صاف دلی کے ذریعے بھی کی جاسکتی ہے یا پھر نظر لگ جانے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جس حد تک فریقین میں معنی مطلب کی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے مکمل ترسیل یا Perfect Communication کی توقع کی جاسکتی ہے ورنہ معنی مطلب کے سمجھنے میں فرق ہونے کی وجہ سے نامکمل ترسیل یا inperfect Communication مختلف شکوک، بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کرکے سماجی بین عمل کے دائرے کو محدود کر دیتی ہے۔

اس بحث سے ظاہر ہے کہ سماجی بین عمل کی بعض صورتیں سماجی وحدت اور سماجی ہم آہنگی میں معاون ثابت ہوتی ہیں تو بعض صورتیں اس کی نفی کرتی ہیں۔

سماجی بین عمل میں ربط اور ترسیل کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے علاحدگی یا Isolation کے تصوّر پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ مکمل علاحدگی کی صورت میں صرف طبعی ماحول سے مطابقت جاری رہتی ہے مگر سماجی ربط اور ترسیل کے تمام ذریعے ختم ہو جاتے ہیں مگر جزوی علاحدگی کی صورت میں فرد اور گروہ سے کسی قدر ربط ضرور برقرار رہتا ہے۔ مکمل اور جزوی علاحدگی کے کئی اسباب ہوتے ہیں مثلاً طبعی ماحول، حادثے، ناتفاقی حالات، غیر سازگار ماحول، کسی حس کا فقدان یا

خرابی، دماغی کمزوری، بیماری، جذباتی انتشار، نسلی یا تمدّنی فرق جو نسلی تعصّب بن جاتا ہے۔ زبان سے ناواقفیت اور ذات پات کے طریق پر مبنی برتری یا کمتری کا احساس۔ یہ وہ مختلف النوع عوامل ہیں جن کی بنا پر افراد اور گروہ سماجی ربط اور ترسیل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غرض سماجی علاحدگی افراد کو سماجیت یا Socialisation کے طریق سے اور گروہوں کو تمدّن کی بین زرخیزیت (Cross - fertilisation of Culture) سے محروم کر دیتی ہے۔ اس موضوع کی تشریح کے سلسلے میں سماجیات اور انسانیات کے ماہروں نے ہمیشہ ایسے بچّوں کی مثالیں دی ہیں جن کی پرورش غیر انسانی (non-human) سماجوں میں ہوئی تھی۔ گو شکل و صورت کے اعتبار سے انھیں انسانی بچّے تو کہا جا سکتا تھا مگر سماجی ربط کے فقدان کی وجہ سے یہ بچّے سماج کے سانچے میں ڈھلنے نہ پائے اور وہ سماجیت کے طریق سے محروم رہے۔ زبان جو خیالوں اور احساسوں کو ظاہر کرنے کا موثر ذریعہ ہے اور جس کی بنا پر انسان اور حیوان میں فرق کیا جا سکتا ہے یہ بچّے اس عطیے سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ غرض سماجی رابطوں کے فقدان کی وجہ سے انسان کے بچّے غیر انسانی سماج میں اس طرح ڈھل گئے کہ ان میں اور جانوروں کے بچّوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سماجی ربط اور ترسیل کا فقدان تمدّنی پست ماندگی یا Cultural Backwardness میں ظاہر ہوتا ہے۔

سماجی بین عمل کی وضاحت کے سلسلے میں تفریق اور مشابہتوں (differences and resemblances) پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یہ تفریق اور مشابہتیں حیاتیاتی عوامل کا بھی باعث ہوتی ہیں اور سماجی اثرات کی پیداوار بھی۔ جن کا اندازہ بات چیت، طرزِ عمل اور رہن سہن کے طریقوں سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ جس قدر افراد اور گروہوں میں یہ فرق زیادہ واضح ہوں گے اسی قدر ان کے درمیان بعد یا فصل زیادہ رہے گا اور جس قدر مشابہتیں زیادہ ہوں گی اسی قدر قربت کا رُجحان تقویت پائے گا۔ گڈنگس (Giddings) کے الفاظ میں ہم جنسی شعور یا Consciousness of Kind مشابہتوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یگانگت بڑھتی ہے، پسندیدگی کا رُجحان اُبھرتا ہے جس کی بنا پر افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔

بعض شخصیتیں مقناطیسی کشش کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں دوسروں کے خیالوں اور رُجحانوں کو متاثر کرنے کی بڑی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ گڈنگس ان ہی شخصیتوں کو اُکسانے

والی شخصیت "instigative Personalities" کا نام دیتا ہے۔ ان شخصیتوں کا ساحرانہ اثر سماجی تفریق کو کم کرنے میں زبردست معاون ثابت ہوتا ہے۔ گو ایسی حرکیاتی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں مگر تاریخ کے ہر دور میں ایسی ہستیاں ضرور پیدا ہوتی رہی ہیں۔

اکثر و بیشتر افراد کے لیے سُجھاوے (suggestions) اور مثالیں تمدّنی محرک ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ تعلیم، رسم و رواج، روایتیں، مختلف رُجحان اور تصوّرات بھی شخصیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوتی ہیں جس کی وجہ سے بین عمل کے طریقوں میں واضح فرق ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض لوگ متموّل اور خوشحال گھرانوں میں پرورش پاتے ہیں جب کہ دوسرے غُربت اور فاقہ کشی کے عالم میں پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ بعض میں فنونِ لطیفہ سے لُطف اندوز ہونے کا خداداد ملکہ ہوتا ہے اور بعض میں نشئہ لطیف کی کمی۔ بعض کو عُمدہ تعلیم میسّر ہوتی ہے تو بعض ساری عمر جہالت کا شکار بنے رہتے ہیں۔ بعض کو بیرونِ مُلک سیاحت کا موقع ملتا ہے تو بعض اپنے ملک کے خوبصورت مناظر سے بھی محروم رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اپنی مخفی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا پورا موقع ملتا ہے تو بعض لوگوں کو اس کا علم بھی ہونے نہیں پاتا کہ ان میں کون سی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ غرض جسمانی خصوصیتوں کی یکسانیت کے باوجود مختلف تمدّنی محرکات مختلف طریقے پر شخصیت کی تعمیر و تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے، زندگی کے معیار اور قدریں بدل جاتی ہیں۔ سوچ بچار اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے ان تجربوں کی بنا پر سماجی بین عمل کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے جسے پارک اور برجیس ارتباطی اور غیر ارتباطی طریق کا نام دیتے ہیں۔ ارتباطی طریق کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

1: تطابق *Accomodation*

2: انجذاب *Assimilation*

اور غیر ارتباطی طریق مقابلہ (*competition*) اور تصادم (*conflict*) میں ظاہر ہوتا ہے ان ارتباطی اور غیر ارتباطی طریقوں کو سمجھنے کے لیے چند عوامل پر غور کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے سماجی توازن متاثر ہوتا ہے جیسے جسمانی ساخت، بچپن میں تعلیم اور تربیت کے لیے اختیار کردہ طریقے جن کی بنا پر مختلف رُجحانوں اور عادتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ خواہشوں اور توقعات کا بر وقت پورا نہ ہونا یا ان کی عدم تکمیل اور تمدّنی تفریقات جو افراد اور جماعتوں پر مختلف

اثرات ڈالتے ہیں۔

مُفاد اور مُحرّک INTEREST AND MOTIVATION

مُفاد: INTEREST

انسان کی ہر سعی و کوشش میں کسی نہ کسی قسم کا مُفاد ضرور مضمر ہوتا ہے۔ چاہے یہ مفاد شخصی اغراض کے اطراف گردش کرے یا خاندانی، معاشی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی نوعیت اختیار کرے۔ بہرحال جدھر دیکھیے انسان مُفادوں کے حصول میں کوشاں نظر آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے مفادات مختلف صورت اختیار کرتے ہیں۔ کبھی قومی مفاد انسان کے پیشِ نظر رہتا ہے تو کبھی خدمتِ خلق کا جذبہ خود فراموشی پر مجبور کرتا ہے۔ بہرحال مفاد کی مختلف نوعتیں انسانی فکر و نظر کے دائرہ میں تنگی اور وسعت پیدا کرتی ہیں۔

جب افراد کے پیشِ نظر محض ذاتی منفعت ہوتی ہے تو سماجی تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے جس کی بنا پر دیرپا سماجی تعلقات کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ تعلقات بہت ہی سطحی اور وقتیہ ہو جاتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کے خیالوں کا احترام کرنے کا خیال باقی نہیں رہتا خصوصاً ایسی تمام کوششیں اور کاوشیں جن کی نوعیت معاشی ہوتی ہے اور جو بُنیادی احتیاجوں اور نجی خواہشوں کے اطراف چکر لگاتی ہیں۔ ان کے باعث افراد میں مقابلہ کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ آپس میں تصادم ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے برخلاف جب مفادوں کا تعلق گروہوں اور اداروں سے ہوتا ہے تو لوگ ایک دوسرے سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں اور وہ ذاتی مفادوں کو پس پشت ڈال کر گروہی فلاح و بہبود کے خیال سے آگے بڑھتے ہیں۔

بہرحال مفادات کی نوعیت چاہے شخصی ہو یا گروہی افراد میں کام کرنے کی زبردست لگن ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جس فرد کے پیشِ نظر خاندانی خوشحالی ہوگی وہ اپنی توجہ اور جانداری کا اس طرح استعمال کرے گا کہ اس سے افرادِ خاندان کے سکون اور بہبودی میں اضافہ ہو بچوں کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا جائے گا۔ وقت اور پیسہ کا بہترین مصرف پیشِ نظر رہے گا جس کی بنا پر بہتر اور خوش آئند خاندانی تعلقات کی پیش قیاسی کی جا سکتی ہے۔

اس کے برخلاف خاندانی امور سے عدم توجہی اور عدم دلچسپی خاندانی انتشار اور

بدسمی میں ظاہر ہوگی اور شخصی مفاد پرستی خاندانی تعلقات کی بنیادیں کھوکھلی کر دے گی۔

اس سلسلے میں یہ نکتہ وضاحت طلب ہے کہ مفاد چاہے شخصی نوعیت کے ہوں یا گروہی، افراد کے پیش نظر جب تک حصول مقصد کی ایک واضح تصویر نہیں ہوگی وہ اپنی کوششوں اور توجہات کو ایک مخصوص نکتے پر مرکوز نہیں کر سکتے۔ تاریخ میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جب کہ افراد اور گروہ اپنی کوششوں سے محض اس لیے مستفید نہیں ہوسکے کیونکہ ان کے ذہن میں اپنی صلاحیتوں کا واضح تصور نہیں تھا۔ اُلجھے ہوئے مقصد اور غیر منظم کوششیں ہمیشہ نفسی اور ذہنی تناؤ اور بار پیدا کرتی ہیں جن کا نتیجہ نزاعوں، تصادم، فرقہ وارانہ فساد اور جنگوں کی شکل میں وقفہ وقفہ سے نمودار ہوتا ہے جس کی بنا پر اتنے مسئلے حل نہیں ہوتے جتنے کہ پیدا ہوتے ہیں۔

غرض مفادات ارتباطی یا associative اور غیر ارتباطی یا disassociative دونوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار لاگ اور لگاؤ، دوستی اور نفرت، محبت اور بیگانگی دونوں جذبوں سے ہوتا ہے۔ جو بالآخر اختلاط یا اختلافات کا باعث بنتے ہیں جس حد تک افراد اور گروہوں میں ایک دوسرے کو سمجھ کر ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے سماجی افعال انجام دینے کی صلاحیت پائی جاتی ہے تو ایسی صورت میں دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہوتا اور مشترک مقصد آسانی سے پورے ہوجاتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے تجربوں سے مستفید ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ سے سماجی میل عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ غرض مفادات کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ

"Interest may be defined as a state of mind of the individual towords a value."

کسی فرد کی ایسی ذہنی کیفیت جو قدر سے متعلق ہوتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں کسی شئے یا object کی قدر و قیمت ہی کے مطابق مفاد کے دائرہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

محرک : MOTIVATION

سماجی زندگی انسان میں کام کی لگن پیدا کرتی ہے اور اونچے مرتبے پر پہنچنے کے لیے زبردست محرک ثابت ہوتی ہے خصوصاً ترقی کی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد میں اعلاسے اعلاتر مرتبے

پر پہنچنے کی تحریک بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس طرح منظم کرتے ہیں کہ وہ مشکلات پر قابو پاکر اپنے معینہ مقصد کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

جب افراد سماجیت یا Socialisation کے طریق سے گزرتے ہیں تو سماجیت کی مختلف ایجنسیاں اپنے سے متعلقہ افراد کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں جن میں خاندان، تعلیمی ادارے، دوست، پڑوسی خاص رول ادا کرتے ہیں۔ یہ مختلف ایجنسیاں متعلقہ افراد کی شخصیت کی نشوونما پر اثرانداز ہوتی ہیں جن کی رہبری اور رہنمائی اعلا حصول مقصد کے لیے زبردست محرک ثابت ہوتی ہے۔

ترقی اور روایتی (traditional) سماجوں میں یہ فرق بہت واضح رہتا ہے کہ ترقی سماج مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں زبردست محرک ثابت ہوتے ہیں جب کہ روایتی سماجوں میں ترقی کے محرکات بہت ہی محدود ہوتے ہیں۔ ترقی سماج میں منطق اور دلائل کسی سماجی فعل کے مرتکب ہونے کا باعث ہوتے ہیں جب کہ روایتی سماجوں میں اندھی تقلید، رسم و رواج، عقیدوں کی پختگی اور روایتوں کی پابندی کھوج اور تجسس کو ختم کر دیتی ہے۔ سماجیات کے ماہروں کی دلچسپی اس امر سے وابستہ ہوتی ہے کہ سماجی محرکات کی وجہ سے کس طرح افراد ایک خاص سماجی سسٹم سے وابستہ ہوتے ہیں اور کس طرح مختلف محرکات کی وجہ سے وہ اونچے سماجی زینوں پر پہنچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور کس طرح ان کے افعالی نمونے سماج کے دوسرے افراد سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

محرکات کی وجہ سے افراد بہتر کارکردگی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جانکاری کا استعمال مشکل سے مشکل فعل انجام دینے پر صرف کرتے ہیں جن کا نتیجہ کسی عمدہ کارنامے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جن افراد کے پیشِ نظر جتنے زیادہ اونچے مقاصد ہوں گے وہ اپنی جانکاری اور وقت کا اتنے ہی بامعنی طور پر استعمال کریں گے۔ انھیں نہ تو سخت محنت گراں گزرتی ہے اور نہ وقتیہ مشکلیں ان کی ہمت پست کرتی ہیں۔ وہ شروع سے آخر تک یکساں دلچسپی اور یکساں جوش و خروش سے کام میں لگے رہتے ہیں تاوقتیکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

ترقی یافتہ اور ترقی سماج سے وابستہ افراد کا فلسفۂ حیات "rags to riches" پر مبنی ہے۔ وہ اس ابدی سچائی میں یقین رکھتے ہیں کہ لگاتار محنت، جان توڑ کوششیں، کام سے

والہانہ لگاؤ اونچے معیارِ زندگی کے ضامن ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ ان سماجوں میں ایسے محرک پائے جاتے ہیں جو بروقت شخصی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا پورا پورا موقع دیتے ہیں اور سماجی زندگی میں ایسے محرکات سے افراد آئے دن دوچار ہوتے ہیں جو ان میں انسان کے شایانِ شان زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے ۔ اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرنے والی دو کتابیں بہت اہم ہیں ایک تو میکلینڈ (Mac Clelland) کی "The Achieving Society" اور دوسری مارکس ویبر (Max Weber) کی
"The Protestant Ethic & the Spirit of Capitalism"
ہے ۔ ان دونوں کتابوں کا موضوعِ بحث مختلف سماجی محرکات ہیں جو قدرتی ذریعوں، سرمایہ داری کے مختلف وسیلوں اور افراد کی صلاحیتوں کو اُبھارنے کے مختلف طریقوں پر زور دیتے ہیں ۔ یہ دونوں سماجی علوم کے ماہر اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ خاص حالتوں کی وجہ سے ایسی شخصیتیں ضرور اُبھرتی ہیں جن کے کارنامے نہ صرف موجودہ پیڑی بلکہ آنے والی پیڑیوں کے لیے بھی نشانِ راہ ثابت ہوسکتے ہیں ۔ لیکن عام حالت میں میکلینڈ کے خیال کے مطابق افراد کی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسے مختلف محرکات پیدا کیے جا سکتے ہیں جن کا نتیجہ انفرادی اور گروہی بہبودی کی شکل میں نمودار ہوسکتا ہے ۔ وہ زیادہ تر سماجیت کے طریق پر زور دیتا ہے جس کی بنا پر ابتدا ہی سے بچوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ ان میں جائز مطالبات کو منوانے کی صلاحیت اُبھاری جا سکتی ہے ۔ ساتھیوں سے تعمیری مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا احساس اجاگر کیا جا سکتا ہے مُستعدی سے کام کرنے کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے ۔ سخت محنت کا عادی بنایا جا سکتا ہے ۔ چاق و چوبند رہنے اور صحت مند زندگی کے اقدار کی پابندی کی طرف توجّہ دلائی جاتی ہے ۔ فہم عام کو تیز سے تیز تر کیا جاتا ہے ۔ نئے علوم اور فنون کے حصول کی ترغیب دی جاتی ہے ۔ ان میں کسی چیز کی صحیح قدر بندی کا رُجحان پیدا کروایا جاتا ہے ۔ غرض اونچی تعلیم اور بہترین نگہداشت کے علاوہ اس قسم کے مختلف محرکات افراد کو ان کی نجی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں ۔

غرض افراد کا تعلق چاہے کسی سماج سے ہو ان میں مخفی صلاحتیں ضرور ہوتی ہیں ضرورت محض اس امر کی رہتی ہے کہ سماج میں ایسے محرکات موجود ہوں جو ان کی مخفی صلاحیتوں کو

اس طرح اُجاگر کریں کہ ان کا استعمال پیدا آور اور بامعنی مقصدوں کے حصول کے لیے کیا جاسکے۔

سماجی طریق کی شکلیں: ارتباطی اور غیر ارتباطی

FORMS OF SOCIAL PROCESSES: ASSOCIATIVE DISASSOCIATIVE

ارتباطی طریق:

مفادات اور محرکات پر سماجی بین عمل کی اساس کی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد سماجی طریق کی دو شکلوں میں غور کرنا ضروری ہے جس میں سے ایک کی نوعیت ارتباطی ہوتی ہے اور دوسرے کی غیر ارتباطی۔ ارتباطی سماجی طریق کی وجہ سے افراد اور گروہ ایک دوسرے سے مُطابقت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور غیر ارتباطی سماجی طریق مقابلوں اور تصادم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ارتباطی سماجی طریق کی نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں جن میں تطابق اور مُطابقت، انجذاب اور تعاون اہم ہیں۔

تطابق: ACCOMODATION

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جب افراد، گروہوں اور انجمنوں کے مفادوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو تناؤ اور کھنچاؤ کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر معمولی سی بات پر اختلاف ہونے کی وجہ سے افراد کے مابین جھگڑا کھڑا ہوجاتا ہے۔ میاں بیوی کے خیالات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ بچّے والدین سے اختلاف کرتے ہیں۔ آجر اور مزدور میں تصادم ہوتا ہے۔ مالک اور نوکر اُلجھ جاتے ہیں۔ قومیں اعلانِ جنگ کرتی ہیں۔ لیکن ہر غیر ارتباطی فعل کے سرزد ہونے کے بعد میل ملاپ کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ جھگڑنے والے افراد ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہتے ہیں۔ بچّے والدین سے معافی چاہتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی بات جاتے ہیں۔ آجر اور مزدوروں میں مصالحت کی کوشش جاری رہتی ہے۔ جنگ کے بعد صلح ناموں پر دستخط ہونے لگتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصادم کے بعد مصالحت ضروری ہے کیونکہ افراد اور گروہ بالآخر کشیدگی کو دُور کرنا چاہتے ہیں اور انھیں اس بات کا اندازہ ہو

جاتا ہے کہ کامیاب زندگی کا راز مقابلے اور لڑنے جھگڑنے میں مضمر نہیں ہے بلکہ مطابقت اور مصالحتی کوششوں کے ذریعے تعلقات کو بہتر بنانے میں پوشیدہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وقفہ وقفہ سے زندگی کے ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ غیر سماجی عناصر کار فرما رہتے ہیں لیکن چونکہ انسانی فطرت سکون اور اطمینان کی طرف مائل رہتی ہے اس لیے انسان کا فطری میلان مل جُل کر زندگی گزارنے کی طرف ہوتا ہے۔

سماجیات کے ماہر جب بھی تطابق کی تشریح کرتے ہیں تو ان کا مطلب ایک ایسے طریق کی طرف ہوتا ہے جس کی بنا پر تصادم پر قابو پانے کے لیے ارادی طور پر مطابقت کی کوشش کی جاتی ہے جس میں امن اور صلح کا عنصر کار فرما رہتا ہے ان تکلیفوں کا احساس رہتا ہے جس میں افراد مُبتلا رہتے ہیں۔ اپنے پسندیدہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چند رعایتیں دینے کا خیال کرنا پڑتا ہے اور اپنی موجودہ حیثیت کے پیشِ نظر روادارانہ برتاؤ اختیار کرنا پڑتا ہے تاکہ اپنے مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ افراد اور گروہ کا رُجحان انجذاب یا *assimilation* کے طریق کی طرف پلٹایا جا سکے۔ کُھلی نزاعوں اور تصادم کو کم از کم کچھ مُعیّنہ وقت تک روکا جا سکے۔ اور جن افراد یا گروہوں میں سماجی فاصلے کی وجہ سے ایک خلیج حائل ہو گئی ہے اُسے کم کیا جا سکے۔

ملون جے۔ ونسٹ (*Malvin J. Winceut*) کے جن خیالوں کی توضیح مندرجہ بالا عبارت میں کی گئی ہے۔ ان سے ملتی جُلتی تشریح پروفیسر گلن اور گلن نے تطابق کے طریق کی بتلائی ہے۔

> *"The process by which competing & conflicting individuals and groups adjust their relationships to each other inorder to overcome the difficulties which arise in competition, contravention or conflict."*

یعنی "تطابق وہ طریق ہے جس کے ذریعے مقابلوں اور تصادم میں گرفتار افراد اور گروہ مقابلے، اختلافات اور تصادم سے پیدا ہونے والی مشکلات پر قابو پانے کے لیے اپنے تعلقات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تطابق کی وجہ سے مخاصمتوں میں گرفتار افراد اور گروہ

ایک دوسرے سے مُطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تطابق کا طریق اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ افراد اور گروہ نزاعوں سے تنگ آ کر تعلقات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اور اپنی عادتوں، رُجحانوں، طرزِ عمل کے نمونوں، ٹکنیک، اداروں اور روایتوں میں تبدیلی لانے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

سماجی طریق افراد کے چُھپے ہوئے جذبوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جو محبّت اور نفرت پر مُبنی ہوتے ہیں۔ جب محبّت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تو تعاوُن ممکن ہوتا ہے جب کہ نفرت کی وجہ سے تناؤ اور کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تطابق کا طریق محبّت اور نفرت کے مِلے جُلے جذبوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لیے سمنر (Sumner) تطابق کو "حریفانہ تعاوُن" یا antagnostic co - operation کا نام دیتا ہے۔ تعلّقات میں دوستی کا جتنا زیادہ رُجحان ہوگا تطابق کا طریق اتنا ہی زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

تطابق ایک ترکیباتی اور سدا بدلنے والا (ever- changing) طریق ہے۔ افراد چونکہ کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ رہتے ہیں اور ان کی دلچسپیاں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اکثر و بیشتر کسی نہ کسی گروہ سے ان کی وابستگی کبھی تعاوُن کی صورت میں نظر آتی ہے تو کبھی مقابلے کا رُخ اختیار کرتی ہے۔ جب اختلافات شدید ہو جاتے ہیں تو افراد کا رُجحان حریفانہ ہو جاتا ہے اور وہ نزاعوں میں اُلجھ جاتے ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد نزاعوں کی شدّت میں کمی پیدا ہوتی ہے اور وہ مطابقت کی ترکیبیں سوچنے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے نئے مقاصد کی تشکیل کی وجہ سے حریفانہ جذبہ دب جائے لیکن وہ ختم نہیں ہوتا بلکہ افراد موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور ازسرِ نو اپنی کھوئی ہوئی قوّت اور اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے کسی بھی دائرہ میں مستقل اور دیرپا مطابقت شاذ و نادر ہی ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر محبت اور نفرت، لاگ اور لگاؤ، سکون اور تناؤ، جنگ اور امن، ہڑتالوں اور مصالحتی کوششوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

تطابق کی نوعیت، ہم حیثیتی تطابق: CO-ORDINATE ACCOMODATION

تطابق کی نوعیت کا دار و مدار افراد، گروہوں اور انجمنوں کے زور اور اقتدار پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تطابق کی دو واضح نوعتیں ہیں پہلی ہم حیثیتی تطابق (Co-ordi-

nate accomodation) اور دوسری برتر یاکمتر حیثیتی تطابق (Super-ordinate or
sub-ordinate accomodation) ہیں۔

جب تصادموں، جھگڑوں اور مقابلوں میں گرفتار افراد یا گروہ "زور اور زر" کے اعتبار سے ہم پلہ ہوتے ہیں تو تطابق کی نوعیت ہم حیثیتی ہوتی ہے۔ مصالحت کی کوششوں میں "دو اور لو" (give & take) کا اصول کارفرما رہتا ہے۔ ہر فریق دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختلافوں کا سدِّباب ہوسکے۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں تو فریقین اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت براہِ راست کر لیتے ہیں البتہ بعض صورتیں ایسی بھی ممکن ہوتی ہیں جب کہ غیر جانبدارانہ فیصلے کی توقع میں تیسرے فریق کی ضرورت ہوتی ہے جس کے فیصلہ کو ماننے کے لیے فی الوقت دونوں فریق آمادہ رہتے ہیں۔ اس قسم کی مصالحتی کوششیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہیں چاہے ان کا تعلق خاندانی زندگی سے ہو، معاشی جد و جہد سے یا سیاسی امور سے۔ غرض نمائندوں کے ذریعے اختلافات کو ختم کرکے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ورنہ غیر منفعت بخش جد و جہد ایک سعیٔ لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ غرض تطابق کے طریق کا انحصار حصولِ مقصد پر ہوتا ہے۔

برتر یاکمتر حیثیتی تطابق:

(SUPER-ORDINATE OR SUB-ORDINATE ACCOMODATION)

جب نزاعوں میں گرفتار افراد اور گروہ زور اور اقتدار کے لحاظ سے غیر مساوی اور ہم پلہ نہیں ہوتے تو تطابق کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے یا اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ برتر فریق موقع محل کے نزاکت سے فائدہ اُٹھاکر مصلحت کی ایسی شرطیں پیش کرتا ہے جن کا قبول کرنا کمتر حیثیت کے فریق کی بقا کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے ورنہ کمتر فریق کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر پیش کردہ شرطیں قبول نہ کی جائیں تو ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ اپنی موجودہ قوت اور صلاحیتوں کی صحیح قدر بندی کرتے ہوئے ایسی صورت میں یہی بہتر سمجھا جاتا ہے کہ شکست کا اعتراف کر لیا جائے۔ کمزوری کو مان لیا جائے اور وقتی طور پر معاہدے کی شرطیں قبول کر لی جائیں اور اندرونی طور پر اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد جاری رکھی جائے تاکہ مستقبل

میں ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔

زندگی میں آئے دن پیش آنے والے بیسیوں مشاہدوں سے تطابق کی اس نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ سماجی تعلقات کا ڈھانچہ ہی احساس برتری اور کمتری کی بنیادوں پر کھڑا رہتا ہے۔ چاہے لوگ زور، اقتدار اور حیثیت کے لحاظ سے برتر اور کمتر ہوں یا عمر، معلومات، تجربوں کی بنا پر دوسرے کے اقتدار کو تسلیم کریں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے کسی میدان میں بھی وقتیہ طور پر ہی کیوں نہ ہو افراد کو ایک دوسرے کی برتری تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے۔

تطابق کے طریقے : METHODS OF ACCOMODATION

تطابق کے طریقوں کا دار و مدار تعلقات اور تمدّن کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ جن تمدّنوں میں جان سے زیادہ لاج کا تصوّر اہمیت رکھتا ہے وہاں آخری وقت تک لوگ مقابلے پر ڈٹے رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ گردن جھکانے کے مقابلے میں گردن کٹانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض تمدّن نزاعوں کو منطقی حد تک برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور جب حقیقتِ حال ان پر واضح ہو جاتی ہے تو وہ وقتیہ طور پر موزوں شرطیں قبول کر لیتے ہیں جو ان کی بقائے حیات کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

تطابق کا سب سے اوّلین طریقہ یہ ہے کہ کمزور فریق اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے برتر فریق کے تشدّد کو قبول کر لیتا ہے چاہے یہ جبر و تشدّد جسمانی ہو یا ذہنی۔ زبردست کا زیر دست کے آگے جھک جانا، غریبوں کا امیروں کے ذریعے استحصال تطابق کے اسی طریقے کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ کوئی تمدّن بھی جنگل کے اس قانون کی حمایت نہیں کرتا کہ "جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" اور نہ لڑائی جھگڑوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

تطابق کا دوسرا طریقہ مصالحت یا Compnise ہے جو عام طور پر برابر کی حیثیت والے فریقین کے مابین ظاہر ہوتا ہے۔ مصالحت کی وجہ سے ہر فریق کو دوسرے کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ رعایتیں دینی پڑتی ہیں۔ اس قسم کا تطابق زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے مثلاً خاندان سے لے کر قومی اور بین الاقوامی معاملات تک۔ یہ ضرور ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے مصالحت کی نوعیت اور شرطیں مختلف ہوتی ہیں۔

تطابق کا تیسرا طریقہ وہ ہے جسے ثالثی طریقہ یا arbitration کہا جاتا ہے جب

براہِ راست طور پر سمجھوتے کی کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں تو تیسرے فریق کی نمایندگی ضروری سمجھی جاتی ہے جس کی رائے اور فیصلے کو دونوں فریق تسلیم کر لیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں ثالث کی وجہ سے صورتِ حال سنگین ہونے سے بچ جاتی ہے اور مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آنے پائی۔ بین الاقوامی جھگڑوں کو سلجھانے میں اقوامِ متحدہ کی تنظیم یعنی U.N.O کو زیادہ اہمیت ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں یونانی شہری مملکتوں میں ثالثی طریقہ بین الاقوامی کشیدگی کو دور کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ چنانچہ سنہ 1907ء میں جو ہیگ کنونشن (Hague Convention) ہوئی تھی اس میں بین الاقوامی ثالثی طریقے کی وضاحت اس طرح کی گئی تھی:

"The settlement of dispute between states by judges of their own choice and on the basis of respect for law."

یعنی "مملکتوں کے مابین نزاعوں کا تصفیہ خود انتخابی منصفوں کے ذریعے عمل میں آتا ہے جن کی اساس قانون کی عزت پر مبنی ہے"۔

غرض نزاعی امور کا فیصلہ کرنے اور جنگ کو روکنے میں ثالثی طریق بہت اہم فرائض انجام دیتا ہے۔ اس طریق میں ثالث کے فیصلہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ثالث سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ غیر جانبداری سے کام لے کر ایسی رائے دے گا جو تخریبی قوتوں کو کچل کر تعمیری عنصروں کو ابھارے گا کیونکہ ہڑتالوں، فسادوں اور جنگوں کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں اکثر و بیشتر محکموں میں لیبر ویلفیر آفیسر یا پبلک ریلیشن آفیسر کے لیے ایک جائداد مختص کی جاتی ہے تاکہ آجر اور مزدور کے تعلقات میں کشیدگی پیدا نہ ہو جس سے بالآخر پبلک کے مفاد متاثر ہوں۔

تطابق کا چوتھا طریقہ رواداری یا Toleration ہے۔ مذہبی معاملوں میں اگر اختلافات پیدا ہوں تو نہ سمجھوتے کارآمد ثابت ہوتے ہیں اور نہ کسی ثالث کا وجود بلکہ فریقین کو ایک دوسرے کے ساتھ روادارانہ سلوک کرنا پڑتا ہے۔ رواداری کے لحاظ سے پالیسی کے کسی بنیادی مقصد میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے افراد کو ایک دوسرے سے عقیدوں کا پاس و لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ گو ہر مذہب کے پیرو اس مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ ان کے مذہبی اعتقادات سب سے مقدس اور افضل و برتر ہیں۔ ان ہی مذہبی وجدانوں کی بنا پر انسانیت کی تاریخ میں

بڑے دردناک واقع درج ہیں جب کہ مذہب کے نام پر انسان کا خون پانی کی طرح بہہ گیا، قتل و غارت گری ہوئی۔ کئی خانماں برباد ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تلوار کے زور اور اقتدار کے گھمنڈ میں لوگوں کے عقیدوں کو بدلا نہیں جاسکتا بلکہ سلامت روی اگر کوئی راستہ ہے تو وہ رواداری کے سلوک کی نشان دہی کرتا ہے۔ اسی احساس کی بناء پر روشن خیال حکومتیں دُنیاوی یا secular ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور جمہوریت کی بقاء کے لیے غیر مذہب والوں سے رواداری برتی جاتی ہے۔ تمدّن کے مختلف نمونوں اور انفرادی خصوصیتوں کو برداشت کیا جاتا ہے۔

تطابق کا پانچواں طریقہ مسلکوں اور عقیدوں کی تبدیلی میں ظاہر ہوتا ہے جسے Conversion کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں سماجی بین عمل کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ افراد ایک دوسرے سے بہت زیادہ ربط میں آنے لگے ہیں جس کی وجہ سے مسلکِ حیات اور اندازِ غور و فکر میں تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی یا تو ذاتی مشاہدوں، نجی تجربوں اور معلومات میں اضافہ کی وجہ سے آتی ہے اور لوگ ایک دبستان کو چھوڑ کر دوسرے دبستان سے وابستہ ہو جاتے ہیں مثلاً سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے سوشلزم کی حمایت کرنا اسی طرح بعض افراد اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں جس میں خود ان کی "تلاشِ حق" کی جد و جہد کا دخل بھی ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ ایسے مذہبی پیشواؤں کے زیرِ اثر آجاتے ہیں جن میں دوسروں کے عقیدوں کو پلٹانے اور اپنے حلقۂ اثر لینے کی ساحرانہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔

تطابق کا چھٹا طریقہ عقلی تاویل یا Rationalisation ہے جس کے مطابق افراد اپنی ناکامیوں، نااہلیت اور کمزوریوں کا عقلی جواز ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رُجحان بہت کچھ افراد کی نفسی کیفیتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب خود اپنے آپ کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ خود اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ایسے افراد کی وافر تعداد ہوتی ہے جو ذاتی ہمدردی میں اس قدر مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنی ناکامی کا سارا الزام دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں کہ ان کی ناکامی دراصل دوسروں کی تنگ نظری اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ بہرحال افراد اپنی شکست کی عقلی تاویل مختلف طور سے کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ثابت کردیں کہ ان کا عمل دُرست اور دوسروں کا غیر واجبی ہے۔

تطابق کے تصوّر، تطابق کی نوعیت اور تطابق کے طریقوں پر غور کرنے کے بعد اس طریق

کے بارے میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تطابق کی وجہ سے فرد اور گروہ کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ نزاعی امور، تصادم، جھگڑوں اور تناؤ کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ برتر اور کمتر حیثیت کی وجہ سے جو سماجی فاصلہ پیدا ہوتا ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی وجہ سے بالآخر کم ہونے لگتا ہے۔ مقابلہ کی وجہ سے جن شخصیتوں اور گروہوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے وہ تطابق کے طریق کی وجہ سے اپنے صحیح مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔ تطابق کا سب سے بہتر نتیجہ انجذاب یا *Assimilation* میں ظاہر ہوتا ہے۔ افراد اور گروہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتنے لگتے ہیں چاہے ان کے انداز فکر ایک دوسرے سے مختلف کیوں نہ ہو اور ان کے اعتقادات اور نصب العین میں فرق ہو۔ غرض تطابق کا طریق سماجی ہم آہنگی کا باعث ہوتا ہے۔

مُطابقت: ADJUSTMENT

سماجیاتی ادب میں مطابقت، غیر مطابقت اور عدم مطابقت کی اصطلاحیں اکثر و بیشتر استعمال ہوتی ہیں جن کے معنی مطلب میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "فلاں شخص میں مطابقت کی صلاحیت پائی جاتی ہے" تو سماجیات کے نقطۂ نظر سے اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس شخص میں سماجی حالات کے مطابق زندگی گزارنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لحاظ سے مطابقت کرنے والے یا *Adjusted* شخص کی تعریف ہوگی:

"An adjusted person is one whose behavior, within re..on, satisfies both his needs and the expectations of others."

یعنی "مطابقت کرنے والا فرد وہ کہلائے گا جس کا برتاؤ، معقول حد تک، اس کی ضرورتوں اور دوسروں کی توقعات کو پورا کرتا ہو"

غیر مطابقت کرنے والا فرد وہ ہوگا:

"An unadjusted person is one whose needs are not yet satisfied but whose search for satisfaction has not led him to violate seriously the expectations of others."

جس کی ضرورتوں کی تکمیل ابھی نہیں ہوئی ہے لیکن جس کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے کی تلاش دوسروں کے توقعات کو بُری طرح مجروح نہیں کرتیں۔

ان دونوں کے برخلاف عدم مطابقت کرنے والا فرد وہ ہوگا:

"A maladjusted person is one who satisfies his needs in such a manner that he seriously violates the expectation of others".

جو اپنی ضرورتوں کو اس طرح پوری کرتا ہے جس سے دوسروں کی توقعات بری طرح مجروح ہوتی ہیں۔

مطابقت کی ان تین نوعیتوں سے افراد کا وہ رُجحان ظاہر ہوتا ہے جو وہ سماجی زندگی گزارنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مکمل طور سے صد فی صد مطابقت زندگی کے کسی بھی شعبے میں ممکن نہیں اس لیے غیر مطابقت اور عدم مطابقت کی کیفیتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

بُنیادی طور پر مطابقت زندگی کی حقیقتوں کو قبول کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے رُجحان پر مبنی ہے جس کے لیے حقیقت یا reality کی نوعیت پر غور کرنا ضروری ہے حقیقت کی تین نوعتیں ہوتی ہیں:

1: شخصی حقیقت Personal Reality
2: سماجی حقیقت Social Reality
3: معقولی حقیقت Objective Reality

شخصی حقیقت ان خیالوں یا رایوں پر مبنی ہوتی ہے جو کوئی شخص اپنے یا اپنے سے وابستہ لوگوں کے بارے میں رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اپنے لڑکے کے بارے میں یہ رائے قایم کرے کہ وہ بُری طرح عادتوں کا شکار ہے۔ اس رائے کی بنا پر جب وہ اپنے رویہ میں تبدیلی کرنا چاہتا ہے تو اس کا یہ خیال چاہے حقیقت پر مبنی ہو یا قیاس پر لیکن یہ مثال شخصی حقیقت پر صادق آئے گی۔

سماجی حقیقت ان خیالوں اور رایوں پر مبنی ہوتی ہے جو عام طور سے افراد دوسروں کے بارے میں قایم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف افراد کا اسی بچّے کے تعلق سے باپ کے خیال کو غلط ٹھہرانا اور یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ باپ خواہ مخواہ غلط فہمیوں کا شکار ہے۔

معقول حقیقت کسی بھی حالات کے مشاہدوں اور قابلِ تصدیق مواد پر مبنی ہوتی ہے۔ سماجی حالات سے متعلق کسی حقیقت کا پتہ اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ لوگ دانستہ طور پر حقیقت کی چھان بین کے لیے تیار نہ ہو جائیں اور ذاتی مشاہدوں اور ان کی تصدیق سے سچائی کا پتہ چلانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے امریکی ماہرِ سماجیات تھامس (Thomas) کا کہنا ہے:

"If men define situations as real they are real in their consequences."

یعنی "اگر لوگ حالات کے حقیقی ہونے کی تشریح کرتے ہیں تو ان کے نتیجے بھی حقیقی ہونے چاہئیں"۔

مطابقت کی انتہائی صورت تو وہ ہوگی جب کہ شخصی، سماجی اور معقول حقیقتوں میں ہم آہنگی ہو اور ایسے ہی شخص کو سماجی حالات سے مطابقت کرنے والا سمجھا جائے گا جس کے خیالات دوسروں کے خیالات سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد مطابقت کرنا کس طرح سیکھتے ہیں۔ اس کا جواب دینے سے پہلے مطابقت کے مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے۔ مطابقت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"Adjustment is a process learned through association withe other people."

یعنی۔ "مطابقت ایسا طریق ہے جو دوسرے افراد سے ربط میں آنے کی وجہ سے سیکھا جاتا ہے"۔

مثال کے طور پر اگر کسی فرد میں اپنا اقتدار جتانے کی زبردست خواہش ہے تو اپنے ماتحتوں پر رعب جمانا شروع کرتا ہے۔ ماتحت اس عمل سے ناخوش رہتے ہیں اور اس ناخوشی کا اظہار ان کے کام کی نوعیت اور طرزِ برتاؤ سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ جو آفیسر کی کم قدری کا باعث ہوتا ہے۔ آفیسر کو بالآخر اس کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ ماتحتوں کے مسائل سے دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ ان سے روادارانہ سلوک کرتا ہے جس سے کام کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس سطح پر آفیسر کے برتاؤ کی وجہ سے آپس کے ضرورتوں کی تکمیل اور دوسروں کی توقعات میں زبردست ٹکراؤ نہیں رہتا۔ دوسرے لوگوں سے ربط میں آنے کی وجہ سے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے جو انسانی مطابقت کے موضوع کا اہم جزو ہے۔

"Each man wants to satisfy his personal needs while conferming, within reason, to the expectations of others."

"ہر شخص معقول حد تک دوسروں کی توقعات کو پورا کرتے ہوئے شخصی ضرورتوں کو تشفی پہنچاتا ہے۔"

جب افراد کا طرزِ عمل شخصی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں سماج کے مروجہ اصولوں کے مطابق ہوتا ہے تو کوئی دشواری پیش نہیں آتی، لیکن جب افراد کو اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ ان کی ضرورتوں کی تکمیل میں مشکلات زیادہ ہو گئی ہیں تو وہ مختلف اُلجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ترشی اور تیز الفاظ کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ لڑائی جھگڑوں میں اُلجھ جاتے ہیں اور بالآخر حالات کے سنگین ہونے کی وجہ سے اپنے بیچ بچاؤ کی کوئی نہ کوئی صورت ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ بھی اُلجھنوں سے مطابقت کرنے کا ایک عام طریقہ ہے۔

مطابقت کا دوسرا طریقہ معینہ مقصد کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں کوئی دوسری سمت میں اپنی توجہ کو پھیر لینا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی فرد کو یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ کوشش کے باوجود موسیقی کا ماہر نہیں بن سکتا تب وہ اپنی توجہ دوسرے فن کی طرف پھیر لیتا ہے۔

مطابقت بعض وقت فرار کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے یعنی اُلجھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے افراد وقتیہ طور پر ہی کیوں نہ ہوں نشہ آور چیزوں کا استعمال کر کے اپنے آپ کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وقتیہ طور پر ہی کیوں نہ ہو انھیں ذہنی انتشار سے فرار حاصل ہو سکے اور وہ خود فراموشی کے عالم میں مگن رہیں۔

اُلجھنی کیفیت سے بچنے کے لیے افراد مختلف قسم کی تاویلیں بھی پیش کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کسی موزوں جگہ پر انتخاب ان کی نااہلی کا نتیجہ نہیں بلکہ متعلقہ عہدہ داروں کی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ ہے۔ اس قسم کی تاویلوں سے وہ اپنے آپ کو بھول بھلیّوں میں ڈال کر وقتیہ طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

مطابقت کرنے کی خاطر بعض افراد اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ صورتِ حال مشکل اور گراں گزرتی ہے لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا ہے ان میں بیدار مغزی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی کمزوریوں کو دُرست کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ موجودہ حالات

سے مطابقت پیدا کرنے کا رُجحان ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کیفیت سماجیاتی نقطۂ نظر سے بڑی صحت مند اور خوش آئند سمجھی جاتی ہے۔

ان مختلف طریقوں سے افراد اپنی اُلجھنوں کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح حالات سے مطابقت کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

مُطابقت کے عوامل :

سماجی حقیقتوں سے مطابقت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ محرک ضرور ہوتا ہے۔ ان میں تین عوامل بہت اہم ہیں:

1: شخصیت *Personality*

2: *"The individual definition of the situation."*

یعنی "کسی حالت یا کیفیت کی انفرادی تعریف"۔

3: *"The social definition of appropriate behavior in this kind of situation."*

یعنی "اس حالت یا کیفیت میں موزوں ترین برتاؤ کی سماجی تعریف"۔

انسانی زندگی میں ایسے کئی مواقع آتے ہیں جب کہ اسے خوشگوار اور ناخوشگوار تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں انسان کا ردِّ عمل اس کی متوازن یا غیر متوازن شخصیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر حیوانیات کا کوئی لکچرار اپنے نفسِ مضمون کی وضاحت کے لیے کلاس میں سانپ لیتا آئے اور اسے جماعت میں چھوڑ دے تو اس وقت طالب علموں کا ردِّ عمل مختلف ہوگا۔ کوئی چیخ پڑے گا، کوئی سہم جائے گا، کوئی کلاس سے باہر بھاگ جائے گا اور کوئی اس کو پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ بہرحال ایک ہی شئے (*object*) سے متعلق مختلف شخصیتوں کا اظہار مختلف ہوگا۔

اس حالت کی انفرادی تاویل جس طرح کی جائے گی اس کا تعلق مطابقت کے دوسرے عامل سے ہوگا۔ اُستاد کے اس عمل کے تعلق سے دو رائیں ہمارے سامنے ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اُستاد پاگل ہے کہ وہ ایک ضرر رساں شئے سے اپنے موضوع کی وضاحت کر رہا ہے اور دوسری رائے یہ ہوگی کہ یہ ایک غیر مضر تجربہ ہے۔ وہ غیر زہریلے سانپ کو کلا س

میں لایا ہے۔ بچوں کے دل سے ڈر نکالنا چاہتا ہے اور زندہ سانپ کو دکھلا کر اپنے بیان کی وضاحت کر رہا ہے۔

ایسے موقع پر موزوں ترین فعل کی سماجی تاویل سے مطابقت کا طریق متاثر ہوتا ہے کیونکہ افراد کی توجہ اس امر کی وضاحت پر مرکوز رہتی ہے کہ دوسرے افراد کا ردِعمل کیا ہے؟ کن حالات میں کون سا فعل خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے اور کن حالات میں اس فعل کی مذمت کی جاتی ہے؟

مطابقت کے عوامل پر غور کرنے کے بعد اس امر پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ آیا مطابقت ایک انفرادی مسئلہ ہے یا سماجی؟ سماجیات کے بیشتر ماہروں نے اس مسئلے کی طرف توجہ کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اکثر و بیشتر صورتوں میں افراد مطابقت کے لیے آمادہ رہتے ہیں مگر سماجی حالات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مطابق نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں سماج میں عدم مطابقت یا بیماری کی کیفیت پائی جاتی ہے ملٹن ایل۔ بیرن (Milton L.Barron) کی کتاب

"The Juvenile in Deliquent Society."

اسی موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس بات کی وضاحت یوں ہو سکتی کہ ہے کہ اگر کسی ملک میں چند افراد بیروزگار ہوں اور جائدادیں خالی ہونے کے باوجود وہ بے روزگاری کو ترجیح دیں تو یہ شخصی عدم مطابقت یا شخصی بدنظمی کی شکل ہو گی۔ لیکن دوسری حالت وہ ہو گی جب کہ کسی ملک میں ہزارہا افراد مختلف پیشوں کی مہارت حاصل کرنے کے باوجود بے روزگار ہیں تو یہ مثال سماجی بدنظمی کی ہو گی جس کی وجہ سے سماج کے معاشی اور سیاسی اداروں کا سنجیدگی سے مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

کئی نفسیات اور سماجیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ شخصی پریشانیوں کی وجہ سے افراد میں غیر مطابقت اور عدم مطابقت کا رُجحان پیدا ہوتا ہے اور یہ شخصی رُجحانات دراصل سماجی مسئلوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک غیر صحت مند سماج میں انسان کی بُنیادی ضرورتوں کا پورا ہونا مشکل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے غیر مطابقت اور عدم مطابقت کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔

انجذاب : ASSIMILATION

انجذاب سے مُراد ایسا سماجی طریق ہے جس کے ذریعے ایک فریق دوسرے فریق یا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خیالوں، رُجحانوں، جذبوں اور روایتوں کو اس طرح اپناتا ہے کہ وہ مشترک تمدّنی زندگی میں گھُل مِل جاتے ہیں اور اُن کے تمدّنی اور ذہنی مرلحے میں جو ایک دوسرے کے قریب آنے سے پہلے غیر یکسانیت پائی جاتی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے اور بتدریج اُن کے مفادوں اور نقطۂ نظر میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

"Assimilation is an advanced social process characterised by decreasing differentiation between individuals and between groups as well as by increased unity of action, attitude and mental processes with respect to common interests and goals."

اس لحاظ سے

سماجیات اور نفسیات کے ماہروں نے انجذاب کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ انھوں نے مہاجرین اور غیر ملکی لوگوں کو غالب تمدّن یا *dominant culture* میں ضم ہوتے دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچّے بھی جوُں جوُں بڑے ہونے لگتے ہیں بالغوں کے تمدّن کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپناتے جاتے ہیں۔ ہندوستانی بچّے جب غیر ملک میں رہنے بسنے لگتے ہیں یا غیر ملکوں کے بچّے ہندوستان میں رہتے ہیں تو وہ اپنے اطراف و اکناف کے ماحول کو اتنی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں کہ ان کے ابتدائی خاندانی اثرات کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کا لب و لہجہ، اندازِ گفتگو، رہنے سہنے کا طریقہ، میل ملاپ کے آداب اور پہناوا سب ہی پر ماحول کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہی حال ان شادی شدہ جوڑوں کا ہوتا ہے جن کا تعلق مختلف

تمدّن سے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے تمدّنی نمونوں کا اس طرح احترام کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں زبردست اشتراکِ عمل نظر آتا ہے۔ مذہبی میدان میں بھی انجذاب کا طریق کارفرما رہتا ہے جو تبدیلِ مذہب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ جب افراد یا گروہ ایک دوسرے سے ربط میں آتے ہیں تو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تبدریج ایک دوسرے کے طریقوں کو اپناتے ہیں۔ یہ دراصل سماجی بین عمل اور سماجی ارتباط کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ مختلف تمدّنی سرمائے سے تعلق رکھنے والے جب کسی ایک جگہ پر آجاتے ہیں تو ایک خوشگوار اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے مشترک تمدّنی نمونوں کو اپنالیں جو دونوں کے لیے قابلِ قبول ہوں اور ایسی درمیانی راہ اختیار کریں جس پر چلنا کسی فریق کے لیے بھی ذہنی اُلجھن کا باعث نہ بنے۔

غرض انجذاب ایک ایسا سماجی طریق ہے جو کسی خاص سماجی گروہ سے وابستہ نہیں بلکہ وہ سماجی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ انجذاب ایک طرفہ طریق ہے جس کی وجہ سے فرد یا گروہ اپنے تمدّنی نمونوں کو چھوڑ کر غالب تمدّن میں جذب ہو جاتے ہیں۔ جب بھی غیر یکساں تمدّن سے تعلق رکھنے والے افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو ان میں باہمی میل جول بڑھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے تمدّنی نمونوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور بالآخر انھیں قبول کر لیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدائی یا Primary نوعیت کے سماجی تعلّقات میں انجذاب کا طریق زیادہ سرعت سے آگے بڑھتا ہے۔

انجذاب کے طریق کو آگے بڑھانے میں چند عامل بڑا زبردست رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم زبان ہے۔ اگر فرد اور گروہ ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں تو انھیں سماجی بین عمل سہولت ہوگی۔ اظہار بیان میں آسانی ہوگی اور وہ اپنے مطلب اور مقصد کو ایک دوسرے پر زیادہ عُمدگی سے واضح کر سکیں گے۔ ورنہ زبان کی عدم واقفیت کی بنا پر غیر معمولی دشواری پیدا ہوگی اور انجذاب کا طریق مشکل معلوم ہوگا۔ غرض سماج میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ تجربوں کی یکسانیت کی وجہ سے فروغ پاتی ہے جو انجذاب کے طریق کا اہم پہلو ہے۔

انجذاب ایک ارتباطی یا associative طریق ہے جس میں بین عمل ایسی شکل اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے افراد ایک دوسرے کے قریب آنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ انجذاب

کے طریق میں فرد خوشگوار اور ناخوشگوار حالات کا اندازہ لگا کر ایسے عمل کی طرف راغب ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے پسندیدہ ہوں۔ چونکہ انجذاب کے طریق میں دوستی کا عنصر مضمر رہتا ہے اس لیے افراد ایک دوسرے کے قریب آنے میں تامل نہیں کرتے۔

انجذاب کے لیے بین عمل کا دائرہ وسیع ہونا ضروری ہے تاکہ لوگ اونچ اور نیچ، برتری اور کمتری کے خیالوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی اچھائیوں کو قبول کرنے کی مائل ہوں۔ اس آزاد بین عمل یا free interaction کے لیے نہ صرف ایک دوسرے کا برسوں تک ساتھ رہنا ضروری ہے بلکہ خیالوں میں وسعت، ایک دوسرے کے تمدنی نمونوں کا احترام ضروری ہے ورنہ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جب کہ مختلف تمدنی نمونوں سے تعلق رکھنے والے افراد میاں بیوی، مالک اور نوکر، آجر اور مزدور کی حیثیت سے برسوں ساتھ رہے لیکن ایک دوسرے کو سمجھنے کی موزوں صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے نفسی اور ذہنی اُلجھنوں میں گرفتار ہوتے گئے۔

انجذاب کے طریق کی وضاحت کے سلسلے میں اکثر سماجیات کے ماہروں نے امریکہ کی مثال دی ہے جسے "Melting pot" کہا جاتا ہے۔ یہاں بسنے والوں میں کچھ ایسے تھے جنھیں آزادی سے محبت تھی۔ کچھ ایسے تھے جنھیں پیسے کا لالچ کھینچ کر لایا تھا، کچھ ایسے تھے جو موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ بہرحال مقصد چاہے کچھ ہو ہر ایک کے پاس قدرت کا کچھ نہ کچھ عطیہ تھا جو وہ امریکہ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے لائے تھے۔ ان میں آئرستانی بھی تھے اور نیگرو بھی۔ ڈچ بھی تھے اور فرانسیسی بھی۔ ہسپانوی بھی تھے اور انگریز بھی۔ ان کے ساتھ ادب بھی تھا اور فن بھی۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے دست و بازو پر اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ کسی کے دست نگر ہونے کو تیار نہیں تھے۔ غرض یہ مہاجرین ایک نئی دُنیا میں مضبوط بنیادوں پر معاشی عمارت کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے زمین صاف کی، بیج بوئے، لکڑیاں کاٹیں۔ کارخانوں اور کانوں میں کام کیا۔ سڑکیں بنائیں، جانوروں کی گلہ بانی کی، غرض انھوں نے بے شمار اور اَن گنت کام کیے۔ وہ جہاں گئے روایتیں ان کی رہنما بنیں۔ ان کے لوک گانے، لوک کہانیاں اور لوک کہاوتیں جن میں برس ہا برس کا تجربہ پنہاں تھا ان کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوئیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود مقصد کی یکسانیت انھیں ایک دوسرے سے اس طرح قریب لائی کہ وہ مشترک تمدن میں گھُل مل گئے۔

اس لحاظ سے انجذاب کے طریق میں جو عوامل معاون ثابت ہوتے ہیں ان میں رواداری، معاشی موقعوں کی یکسانیت، اجنبیوں اور ان کے تمدن سے ہمدردی، تمدنی نمونوں کی مشابہت

شامل ہے۔ رواداری کی وجہ سے ترسیل یا Communication کا عمل بہت زیادہ آسان ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے تعلقات بہتر ہوتے ہیں اور لوگوں میں اندرونی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گھُل مل کر زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس دَور میں بھی لوگوں کو تبدیلِ مذہب یا کسی خاص سیاسی مسلک کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا یا ان پر دباؤ ڈالا گیا تب لوگوں نے ترکِ وطن کو ترکِ مذہب یا ترکِ مسلک پر ترجیح دی اور ایسے ملکوں میں پناہ لی جہاں ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔

ہر وہ معاشی نظام جو روایتی بندھنوں کو توڑ کر افراد کو محض ان کی نجی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بناء پر ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے وہ انجذاب کے طریق کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس کے برخلاف جہاں نسل، جائے پیدایش، خاندانی امارت کی بناء پر افراد اور گروہوں میں امتیاز کیا جاتا ہے وہاں انجذاب کے طریق میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

تعاون: CO-OPERATION

سماجی زندگی میں دو عنصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ تعاون اور مقابلہ۔ تعاون کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے سے ہمدردی کا رُجحان پیدا ہوتا ہے اور وہ مشترک اغراض کو حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مقابلہ کا خیال افراد میں بعد اور فصل پیدا کرتا ہے۔ ان میں علاحدگی کا رُجحان بڑھتا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی صُحبت گراں گزرنے لگتی ہے۔ زندگی میں بیسیوں مثالوں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ شادی اور طلاق، کام اور ہڑتال، بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ فسادات ان ہی رُجحانوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن ہر سماج میں ان تعمیری اور تخریبی عنصروں میں توازن قایم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تعاون اور مقابلہ کی نوعیت زمان و مکان اور موقع محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی ملک میں طلاق کی شرح زیادہ ہے تو کسی میں کم۔ کسی ملک میں ذات پات اور رنگ و روپ پر مبنی احساسِ برتری اور کمتری زیادہ ہے تو کسی میں کم۔ بہرحال تمدّن اور مقابلے کی شِدّت کو بڑھانے اور کم کرنے میں تمدّنی اثرات کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔

سماجی مفکرین کا خیال ہے کہ سماجی بین عمل کی سب سے بُنیادی شکل تعاون ہے اور انسان کی زندگی تعاون، مقابلہ اور تصادم کے اطراف گردش کرتی ہے۔ ان مفکرین کا خیال ہے کہ عضویہ کا ارتقار خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہر نوع اپنی بقار کے لیے ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ موزوں ترین کی بقایا "Survival of the fittest" کا نظریہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ سب سے زیادہ تعاون کرنے والے عضویے ہی بقار کے مستحق ہوتے ہیں۔

جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جو سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہو تو اس صورت کو تعاون کہا جاتا ہے۔ گویا تعاون کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کی کوششوں میں اس طرح نظم اور ضبط رہے کہ اس میں دونوں فریق کا فائدہ شامل رہے:

"Co-operation is a form of social interaction where in two or more persons work together to gain a common end."

یعنی "تعاون سماجی بین عمل کی وہ شکل ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔"

افراد اور گروہوں میں تعاون اسی تناسب سے پایا جاتا ہے جس تناسب سے ان میں ایک دوسرے کو سمجھ کر ہمدردی کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ تعاون کے لیے سمجھداری کی سخت ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے کے احساسوں کی قدر اور ہمدردی بھی ضروری ہے۔

تعاون کی ابتدائی نوعیت تو وہ ہے جب کہ افراد ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں مثال کے طور پر کسی کو مشکل کا سامنا کرتے دیکھ کر مدد کے لیے آگے بڑھنا یا کسی کی موٹر کو کیچڑ میں دھنسا دیکھ کر ڈھکیلنے میں مدد دینا۔ اس قسم کے تعاون میں ذاتی غرض یا مفاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے کئی سماج ہیں جہاں پیسے کی فراوانی اور ضرورت کی اشیاء کی بہتات ہونے کے باوجود افراد ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرتے ہیں تاکہ وہ خوشگوار تعلقات کا لطف اُٹھا سکیں۔

تعاون کی دوسری نوعیت وہ ہے جب کہ مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگ

ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی عمارت کی تعمیر میں مختلف فن دانوں اور کاریگروں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانا۔

تعاون کا مفہوم اس وقت اور بھی واضح ہوتا ہے جب ہم مقابلے کے طریق پر غور کرتے ہیں۔ کشمکشِ حیات کا سب سے بنیادی اصول مقابلہ ہے اور مقابلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ضرورت اور تعیشات کی اشیاء وافر مقدار میں میسّر نہ ہوں۔ ان محدود چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے لوگ برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ملک میں تعلیم یافتہ اور فن دان افراد کی زیادتی ہو اور جائدادیں محدود۔ ایسی صورت میں تعاون کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ مقابلہ جاری رہتا ہے۔

مقابلہ زندگی کے کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ ضروریات زندگی کے علاوہ آرام اور آسایش کی اشیاء، سماجی حیثیت، شہرت، زور اور اقتدار، شادی بیاہ غرض زندگی کے ہر پہلو میں لوگ بہتر حیثیت اور اونچے معیار پر زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

غرض مقابلے کا تعلق سماجی قدروں سے ہوتا ہے۔ جن چیزوں کی سماج میں زیادہ قدر ہوتی ہے یا وہ اشیاء اونچے معیار کی سمجھی جاتی ہیں لوگ ان کے حصول کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تعلقات کی نوعیت سے مقابلے کی شکلیں بدل جاتی ہیں مثلاً خاندان کے افراد دوست احباب، والدین اور بھائی بہن ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں بلکہ تعاون کے ذریعے ایک دوسرے وابستہ رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے تمام افراد جن کی طبیعتوں میں "دو اور لو" کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے وہ چاہے کارخانوں میں کام کریں یا کسی دفتر میں وہ مقابلے سے زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرکے اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں۔ بہرحال ارتسال یا Communication افراد کے مابین جتنا زیادہ مکمل ہوگا اور بین شخصی یا inter per-sonal تعلقات جتنے زیادہ خوشگوار ہوں گے اس لحاظ سے تعاون اور مقابلے کی نوعیت متاثر ہوگی۔

تعاون کے وقت افراد کے بیشِ نظر ذاتی مفاد ضرور ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں کہ باہمی تعاون سے جو نتیجہ نکلے گا اس میں ان کا کتنا فائدہ رہے گا؟ لہٰذا

فائدہ کے تناسب سے تعاون میں شدّت اور کمی پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ تعاون کا نتیجہ غیر یقینی ہے تب ان کے رُجحانوں میں اسی تناسب سے فرق نظر آتا ہے۔

بہرحال تعاون اور مقابلہ سنساری نوعیت کے حامل ہیں جو فطری طور پر ہر جاندار عضویے کی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ اس لحاظ سے سطحی طور پر انھیں تعمیری یا تخریبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہر سماج کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ تعاون اور مقابلے میں خوشگوار امتزاج پیدا کیا جا سکے۔ اس لیے ہر تمدّن حدود کا تعیّن کرتا ہے کہ کون سے لوگ، کس کے ساتھ، کس وقت پر اور کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی سماج میں مقابلے کو کامیابی اور ترقی کی بُنیاد قرار دیا جاتا ہے تو کسی سماج میں تعاون کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض ان دونوں طریق کی نوعیت سماجی حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔

امریکی سماج میں مقابلے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسے کامیابی اور ترقی کا ضامن سمجھا جاتا ہے لیکن امریکیوں کے اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے کے لیے ان کے کُھلے سماجی سسٹم (Open Social system) اُن کے مسلکِ حیات ان کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ ان کے سیاسی جمہوری نظام، نسلی امتیاز کی پالیسی، افراد کی عملی اور فنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کی سہولتیوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

غیر ارتباطی طریق: تصادم اور مقابلہ

DISSOCIATIVE PROCESSES: CONFLICT & COMPETITION

تصادم: CONFILICT

تصادم کی اساس جسمانی، ذہنی، نفسی اور تمدّنی اختلافات ہیں۔ ان اختلافوں کی بناء پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بے اعتنائی برتتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے ایسا جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے ایک دوسرے کو نقصان پہنچ سکے۔ چونکہ تصادم میں غصّے اور نفرت کے جذبات مِلے جُلے ہوتے ہیں اس لیے ایک فریق دوسرے فریق کو اذیت پہنچانا چاہتا ہے۔

"Conflict may be defined as that social process in wick individuals and group's seek their ends by directly challenging their

rivals through actual violence or the threat of violence."

یعنی "تصادم سے مراد ایسا سماجی طریق ہے جس میں افراد اور گروہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر جارحانہ حملہ کرتے یا جارحانہ حملہ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں"۔

تصادم کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ شخصی تصادم، نسلی تصادم، طبقاتی تصادم، سیاسی تصادم اور بین قومی تصادم۔

شخصی تصادم اکثر و بیشتر صورتوں میں بغض پر مبنی ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو کسی معقول وجہ کے بغیر ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مضحکہ خیز ناموں سے پکارتے ہیں، گرے ہوئے الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ ان پر جملے کستے ہیں۔ دھمکیاں دیتے ہیں اور بالآخر ہاتھا پائی پر اُتر آتے ہیں۔ اس قسم کے تصادم میں نفرت کے جذبات پنہاں رہتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے پر اقتدار جمانے کی خواہش رہتی ہے۔

انسانی تاریخ نسلی تعصّب کی داستان سے بھری پڑی ہے۔ جب کبھی مختلف نسلوں سے تعلّق رکھنے والے ایک دوسرے کے قریب آئے ان میں برتری اور کمتری کا احساس اجاگر ہُوا جو بالآخر تصادم کا باعث بنا۔ گوروں اور کالوں کی لڑائیاں، گوروں اور جاپانیوں میں باہمی تناؤ اور کھنچاؤ، برہمنوں کے ہاتھوں ہریجنوں پر مظالم ایسی کھُلی سماجی حقیقتیں ہیں جن کی بنا پر کبھی کھُلی اور کبھی چھپی جنگیں وقفے وقفے سے جاری رہیں۔

نسلی تصادم دراصل تمدّنی اختلافات اور مفادوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ گروہی ٹکراؤ کسی ایک گروہ کے اقتدار اور ذاتی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مفادات چاہے سماجی اقدار کے اطراف گردش کریں یا سیاسی اقتدار کے۔ چاہے وہ معاشی اغراض کا نتیجہ ہوں یا مذہبی وجدانوں کا ہمیشہ برتر قوتیں کمزور افراد اور قوموں کا استحصال کرتی رہی ہیں۔ گروہی تصادم کے متعلق کسی قسم کی پیشن گوئی ممکن نہیں بلکہ یہ سماجی حالات، مقام اور وقت کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

سیاسی تصادم قومی اور بین قومی دونوں صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی قوم میں مختلف سیاسی جماعتوں کے ٹکراؤ قومی تصادم کی نشانی ہیں اور مختلف قوموں کے درمیان تصادم بین قومی صورتِ حال ہو گی۔ مختلف جنگیں قومی تصادم کی عام مثالیں ہیں جب کہ جذبۂ حب الوطنی سے

مجبور ہوکر خاندان اور جائداد کو پسِ پشت ڈال کر ملک کی حفاظت کا خیال لے کر افراد میدانِ جنگ میں اُتر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تصادم کے ماخذ اور بھی کئی ہوتے ہیں جیسے معاشی اغراض، فتوحات کی خواہش، ملک کے حدود بڑھانے کے نتائج، سیاسی مسلک اور مذہبی وجدانیت۔

موجودہ زمانے میں تصادم کا اہم ذریعہ معاشی اغراض ہیں۔ مختلف صنعتی اداروں میں مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے آجر اور مزدوروں میں اکثر و بیشتر تناؤ اور کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے جو واک آؤٹ، "کام بند کرو" اور ہڑتالوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر کاروباری اداروں میں لوگ بے اطمینانی کا اظہار مختلف مظاہروں کے ذریعے کرتے ہیں۔

غرض تصادم کا اصل ماخذ مفادوں اور اغراض کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ٹھیک کہا تھا کارل مارکس اور فریڈرِش اینگلز نے کہ "دُنیا کی تاریخ طبقاتی تصادم کی ایک لامتناہی داستان ہے"۔

اچانک تبدیلیاں بھی مختلف افراد اور سماجوں میں تصادم کا باعث بنتی ہیں۔ اچانک تبدیلیوں کی وجہ سے پُرانی قدریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سماجی تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب افراد کھیتی باڑی کے مقابلے میں کارخانوں میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تو مشینی زندگی کی وجہ سے سوچ بچار کے طریقے متاثر ہوتے ہیں۔ تمدنی اختلافات اور مفادوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے انتشار اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔

سماج پر تصادم کے مختلف اثرات ترتب ہوتے ہیں۔ جب تصادم دو مختلف گروہوں میں ہوتا ہے تو ایک ہی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد میں تعاون اور اتحاد بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ گروہ کی بقا اور گروہی اقدار کی حفاظت ان کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اسی لیے وہ اندرونی اختلافات کو اس وقت نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خیالات اور مقصد میں یگانگت بڑھنے لگتی ہے، لیکن جب تصادم ایک ہی گروہ سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد میں ہوتا ہے تو گروہ کی وحدت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔

تصادم کے بعد عام طور سے شخصیتوں میں تغیر نمودار ہوتا ہے۔ چونکہ تصادم کے بعد اُلجھنیں ختم ہو جاتی ہیں، نفسی اور ذہنی بار کم ہو جاتا ہے، خود غرضیوں اور مفاد پرستی کی وجہ سے جو کوتاہ بینی پیدا ہو گئی تھی وہ بڑی حد تک قابو میں آ جاتی ہے اس لیے مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

ہر ملک اور قوم کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جب کہ تصادم کی قیمت انسانی

خون، مالی نقصان، تہذیب اور تمدن کی بربادی کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ ہر جنگ کا نتیجہ بربادی اور غارت گری میں نمودار ہوتا ہے۔ فاتح قوم مفتوح قوم کا استحصال کرتی ہے اور مفتوح قوم گو وقتیہ طور پر اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہے مگر نفرت کے جذبات دل و دماغ میں اس شدت سے جاگزیں رہتے ہیں کہ وہ چھپے ہوئے طریقے سے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اور مقام کو حاصل کرنے کی تیاریاں کرتے اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ بروقت بدلہ لیا جاسکے۔ البتہ جب نزاعوں میں گرفتار افراد، گروہ اور ملک طاقت کے اعتبار سے ہم پلہ ہوتے ہیں تو ان میں ایک دوسرے کو مکمل طور سے نیست و نابود کرنے سے پہلے یہ خیال رہتا ہے کہ وہ ایسے سمجھوتے پر آمادہ ہوجائیں جو فریقین کے لیے قابلِ قبول ہو۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تصادم انسانی زندگی کی ایک ناگزیر کیفیت ہے۔ سترھویں صدی کا انگریز مفکر تھامس ہابس (Thomas Hobbes) اس خیال کا حامی تھا کہ انسانی فطرت میں بدلہ لینے اور غارت گری کا جذبہ فطری طور پر موجود رہتا ہے لیکن حکومت ایسے قانون اور ضابطے مرتب کرتی ہے جس کی وجہ سے طاقتور کمزور کو مکمل طور سے نیست و نابود نہیں کر سکتے گو ان کا استعمال ہوتا رہتا ہے۔ یہاں پر انسانی اور حیوانی سماج کا فرق بھی واضح ہوتا ہے۔ حیوانی سماج میں تصادم کھلا رہتا ہے جس کا اظہار ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے، دانتوں، سینگوں اور پنجوں سے کاری ضرب پہنچانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب کہ انسانی سماج میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ان گنت طریقے ہوتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے کے مدِمقابل ہونے کی بھی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہ کر زہریلی گیس اور بموں کے استعمال سے چند گھنٹوں کے اندر سارے ملک کو خاکستر کر دیا جاسکتا ہے۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے الفاظ کا استعمال بھی ضروری نہیں ہے بلکہ نفسی اور ذہنی تکلیف کئی طریقوں سے پہنچائی جاسکتی ہے۔ نام، شہرت اور کیریر کو بری طرح نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔

مُقابلہ: COMPETITION

مُقابلہ ایک غیر ارتباطی سماجی طریق ہے جو بُنیادی اور سنساری نوعیت کا حامل ہے۔ تاریخ کے ہر دَور، سماجی زندگی کے ہر پہلو اور عمر کے ہر حصّے میں مُقابلہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ موقع محل کے لحاظ سے مُقابلے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ کبھی ظاہر تو کبھی

مخفی، کبھی تعمیری تو کبھی تخریبی۔
مقابلہ کا ایک واضح تصور پیش کرنے کے لیے تعاون، تصادم اور مقابلہ کی تعریفوں کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہیے:

"When two or more human beings are working together to achieve objectives that will be mutually beneficial to all concerned, they are engaged in co-operation."

یعنی "جب دو یا دو سے زیادہ افراد کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ساتھ کام کرتے ہیں جو دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو تو وہ صورت تعاون کی ہوگی۔"

اور

"When two or more individuals are striving to thewart, harm or destroy one another, they are engaged in conflict."

یعنی "جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک دوسرے کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں، انہیں نقصان پہنچاتے ہیں یا فنا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ صورت تصادم ہوگی۔"

اسی طرح

"When to or more individuals are trying to obtain prossession of somthing that is not available in quantitites sufficient to Satisfy all of them, they are engaged in competition."

یعنی "جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک ایسی چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اتنی مقدار میں موجود نہیں ہے جو سب کے لیے کافی ہو سکتے تو یہ صورت مقابلہ کی ہوگی۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ مقابلے کی نوبت اس وقت آتی ہے جب کہ ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے ذرایع مقدار اور تعداد کے لحاظ سے محدود ہوں اور ان کی فراہمی مشکل ہو جائے۔ ملازمتوں کے سلسلے میں اکثر و بیشتر یہی چکر رہتا ہے کہ قابل اور ٹریننگ یافتہ افراد کی تعداد

زیادہ اور ملازمتیں محدود۔ یہی نہیں بلکہ برسرِ روزگار افراد اونچے درجے پر پہنچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور جو وظیفہ پر سُبکدوش ہوجاتے ہیں وہ پھر اپنے سابقہ تجربے اور معلومات کی بنا پر دوبارہ ملازمت کرنا چاہتے ہیں یا نوکری کی مدت میں توسیع چاہتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی پیچیدہ صورتیں مقابلے کے دائرے کو بہت مشکل اور وسیع بنا دیتی ہیں۔ مقابلہ صرف ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے ہی جاری نہیں رہتا بلکہ آرام اور آسایش کی اشیاء، سماجی حیثیت، شادی بیاہ، نام و نمود، زور و اقتدار کے لیے بھی افراد اور گروہوں میں رَسّہ کشی جاری رہتی ہے۔

مقابلہ حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے اور حصولِ مقصد کا تصور جتنا زیادہ صاف اور واضح رہتا ہے مقابلہ کے نتیجے اتنے ہی زیادہ کامیاب اور ہمت افزا نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے لیے بہترین طالب علموں کا آپس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش۔ لیکن جب مقابلہ کسی شئے یا object سے ہٹ کر کسی ہستی کی طرف مرکوز ہوجاتا ہے تو اس کا نتیجہ رقابت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں افراد کے پیشِ نظر انعام حاصل کرنے کا رُجحان اتنا زیادہ نہیں ہوتا جتنا کہ کسی ہستی کو شکست دے کر اس پر بازی لے جانا۔ اس قسم کی ذہنیت سے جو مقابلہ شروع ہوتا ہے اس میں لڑائی جھگڑوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

مُقابلے کے فعل: FUNCTIONS OF COMPETITION

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مقابلے کی وجہ سے افراد میں آگے بڑھنے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ ہر سماج میں مقابلے کے جذبے کو اُبھارنے کے مختلف مُحرک ہوتے ہیں جن کی بنا پر ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نئی راہیں کُھل جاتی ہیں۔

مقابلے کی وجہ سے افراد اور جماعتوں کی توجہ متبادل ذریعوں پر مبذول ہوجاتی ہے اور اس سلسلے میں نیا فلسفۂ حیات، زندگی گزارنے کے نئے طریقے، نئی ایجادیں مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ انتخاب کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔ اس کا اندازہ تاریخ کے تقابلی مطالعہ سے ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے میں انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افراد کو جو کچھ بھی میسّر آجاتا وہ اسی پر قانع ہوجاتا۔

مقابلے کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہوجاتا ہے کہ انسان اپنی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مختلف راستے نکال لے۔ وہ کسی چیز کو حاصل نہ کرنے کی وجہ سے پست ہمت نہیں ہوتے

بلکہ موجودہ زمانے میں سماجی بین عمل کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے وہ اپنی دلچسپیوں کے لیے کچھ نہ کچھ بدل ضرور ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں مقابلے کا یہ فعل ہوتا ہے کہ وہ افراد کو بہتر تعلقاتی نظام سے وابستہ کر دے۔

مقابلے کی وجہ سے مختلف افراد کی مختلف پیشوں میں تقسیم ممکن ہو جاتی ہے جسے درکائم بہت ہی عمدگی سے "The social division of labour" یا سماجی تقسیم کار کا نام دیتا ہے۔ سماج کی یہ فعلی اکائیاں (functional units) ماہرانہ طور سے سماج کی مختلف ذمہ داریاں ادا کرتی ہیں جیسے تعلیمی، معاشی، سیاسی، مذہبی اور تفریحی وغیرہ۔ ان میں مقابلہ بھی جاری رہتا ہے اور تعاون بھی۔ ان کے نتیجے تعمیری بھی ہوتے ہیں اور تخریبی بھی۔ اس لحاظ سے مقابلے کو ایک غیر ارتباطی طریق قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ مقابلے کی وجہ سے مخفی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ افراد میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو بالآخر سماجی استحکام کا باعث بنتی ہے۔ مقابلے کی وجہ سے مختلف سماجی درجوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے مقصد کی بہتر طریقے پر تکمیل کے لیے متحد ہو جاتے ہیں جن کی نمائندگی مختلف تنظیموں اور انجمنوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

مُقابلے کی قسمیں:

مُقابلے کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(1) شخصی مُقابلہ Personal competition

(2) غیر شخصی مُقابلہ Impersonal competition

شخصی مقابلے میں حریف ایک دوسرے کے مدِّمقابل ہوتے ہیں۔ چاہے یہ مقابلہ رفیقِ حیات کے انتخاب کے لیے ہو یا روزگار، لیڈری، بیوپار یا بہتر سماجی حیثیت حاصل کرنے کے لیے۔ بعض وقت شخصی مقابلہ رقابت کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

غیر شخصی مقابلے میں ہمیشہ فرد کسی سماجی گروہ کے رُکن کی حیثیت سے شریک رہتا ہے۔ یہ مقابلہ معاشی، سیاسی، تفریحی، تعلیمی اور مذہبی گروہوں میں جاری رہتا ہے جو اپنے مسلک اور مقصد کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سماجیات کے ماہروں نے مقابلے کی مختلف نوعیتوں پر روشنی ڈالی ہے جن میں معاشی، تمدّنی، مذہبی اور نسلی مقابلے شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے

ذریعوں میں توازن باقی نہیں رہتا تو معاشی مقابلہ پیدا ہوتا ہے جسے معاشیات کے کلاسیکی مفکر پیدائش اور تقسیم دولت کے بہترین طریقوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن افراد میں پیدائش دولت کی بہترین صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ کمتر صلاحیت کے لوگوں پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے سماج میں معاشی درجوں کا تعین ہوتا ہے۔ خود سماج کے لیے ایسی حالت مُفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ قابل ترین افراد کی وجہ سے بہتر سامان بازار میں آتا ہے۔ بہتر خدمتوں سے لوگ مُستفید ہوتے ہیں۔ ضروریات کی چیزیں کم داموں پر مل سکتی ہیں۔ غرض مقابلے کی وجہ سے آبادی کی تقسیم صلاحیتوں کی بنا پر ممکن ہوتی ہے لیکن ہر سماج کی یہ کوشش رہتی ہے کہ مقابلے کو انتہائی صورت اختیار کرنے سے روکا جائے تاکہ اس سے سماجی سسٹم کو دھکہ نہ پہنچے۔ امداد باہمی کی انجمنوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ مقابلے کی شدّت کو کم کریں۔ اجارہ داری کو حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے تاکہ صارفین کا نقصان نہ ہو اور قیمتوں کا تعین کیا جا سکے۔

تمدّن کے مختلف نمونوں میں ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ نووارد گروہ اپنے تمدّن کی برتری کو مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً ہندوستان میں آریاؤں اور انگریزوں کے داخل ہونے کے بعد مقامی لوگوں کے افعال و اعمال کے نمونوں میں کافی تبدیلی آئی۔

مذہبی میدان میں مقابلہ دراصل تمدّنی مقابلے کی پھیلی ہوئی شکل ہے۔ یہ مقابلے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ تبلیغ کے ذریعے لوگوں کے مذہبی عقیدوں کو پلٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مختلف قسم کی ترغیبیں دی جاتی ہیں جو بہتر دُنیاوی اور دینی زندگی پر حاوی ہوتی ہیں یہ لیکن بعض وقت مذہبی جنون اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ نہ صرف مختلف گروہوں میں تصادم پیدا ہوتا ہے بلکہ انتہائی صورتوں میں اس کا نتیجہ قتل و غارت گری اور انسانیت سوز حرکتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

فہرست کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا

1- Gillin and Gillin: "Cultural Sociology."

2- Bogardus, E.S. "The Development of Social Thought." Longmans. N.Y. 1955. p. 436.

3- Ibid. p. 557.

4- Gillin and Gillin. p. 489.

5- Rose, A.M. "Sociology." Knopf. N.Y. 1965. p. 46.

6- Young, K: "Sociology: A Study of Society & Culture." American Book Company. N.Y. 1942. p. 3.

7- Gillin and Gillin. p.

8- Ibid.

9- Dressler, D: "Sociology—The Study of Human Interaction." Knopf. N.Y. 1975. p. 229.

10- Ibid.

11- Ibid.

12- Ibid. 234.

13- Dressler. p. 282.

14- Ibid. p. 287

15- Ibid. p. 284.

ساتواں باب

سماجیت

SOCIALIZATION

کسی بھی سماج کی بقاء کا دار و مدار افراد کی بقاء پر منحصر ہے جو سماج میں مختلف رول ادا کرتے ہیں۔ سماج کی بقاء اور سماجی زندگی میں تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سماج میں نئے ارکان مسلسل بھرتی ہوتے رہیں تاکہ نئے ارکان ان پرانے ارکان کی جگہ لے سکیں جو اپنی طبعی عمر کو [illegible] یا مختلف حادثوں کا شکار ہو کر موت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان نئے ارکان میں سماجی معیاروں اور سماجی قدروں کا منتقل ہونا ضروری ہے تاکہ ان کے افعالی نمونے (behavior patterns) سماج کے لیے قابلِ قبول ہو سکیں۔

سماجیاتی ادب میں سماجیت کا موضوع مرکزی اہمیت کا حامل ہے اور ہر مفکر اپنے نقطۂ نظر سے سماجیت کے موضوع کی تشریح کرتا ہے۔ سماجیت سے متعلق ایک واضح تصور قایم کرنے کے لیے چند مفکرین کی تعریفوں پر غور کرنا چاہیے۔ پروفیسر لنڈ برگ (Prof. Lund berg) کا کہنا ہے:

"The process of interation through which the individual learns the habits, skills, beliefs and standards of judgement required for effective Participation in social Groups are called socialization."

یعنی "بین عمل کا وہ طریق جس کے ذریعے فرد عادتوں، عقیدوں، ہنر اور فیصلے کے معیاروں

کو سیکھتا ہے جو سماجی گروہ میں بااثر اشتراک کے لیے ضروری ہیں سماجیت کہلاتا ہے"۔

ڈیوڈ ایل مچل (David L. Mitchell) کی تشریح کے مطابق

"Socialization is the process where by the biological orgarnism, man, is transformed into a person with a sense of identity and the ability to discipline himself who will have ideals, ambitions and values."

یعنی "سماجیت وہ طریق ہے جس کے ذریعے ایک حیاتیاتی عضویے "آدمی" کو احساس شناخت اور اس صلاحیت کے ساتھ انسان میں تبدیل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے میں نظم اور ضبط پیدا کر سکے"۔

گلن اور گلن (Gillin and Gillin) کے نقطۂ نظر سے

"Socialization is the process by which the individual develops into a functioning member of the group, acting according to its standards, conferming to its mores, observing its traditions and adjusting himself to the social situations he meets sufficiently well to command the tolerance if not the admiration of his fellows."

یعنی "سماجیت ایسا طریق ہے جس کے ذریعے فرد گروہ کا ایک کارکردگی رکن بنتا ہے۔ سماج کے معیاروں کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ سماجی اقدار کی پابندی کرتا ہے۔ سماجی روایتوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے سماجی حالات سے اس طرح مطابقت پیدا کرتا ہے کہ اس کا طرزِ برتاؤ قابلِ تحسین نہ سہی، قابلِ برداشت قرار دیا جا سکے"۔

فشٹر (Fichter) سماجیت کے طریق کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

"Socialization is a process of mutual influence between a person & his fellow men. A

process that results in an acceptance of and adaptation to the patterns of social be haviour."

یعنی "سماجیت باہمی اثر اندازی کا ایسا طریق ہے جو فرد اور اس کے ساتھیوں کے درمیان جاری رہتا ہے ۔ یہ ایسا طریق ہے جس کا نتیجہ سماجی افعالی نمونوں کے قبول کرنے اور ان سے مطابقت کرنے میں ظاہر ہوتا ہے"۔

ان مختلف تعریفوں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شخصیتیں (personalities) تیار شدہ حالت وجود میں نہیں آتیں بلکہ ایک حیاتیاتی عضویہ (biological organism) کو سماجی عضویہ (Social orgnism) میں تبدیل کرنا پڑتا ہے جس کے لیے نہ صرف طویل عرصہ درکار ہوتا ہے بلکہ اس کے لیے وقت، جانداری اور پیسہ کافی صرف کرنا پڑتا ہے ۔ اس امر کی وضاحت انسان اور جانور کے بچوں کے تقابلی مشاہدہ سے ہوتی ہے ۔ جانور کے بچے کے لیے اس کی جبلت اور گرد و پیش کی مفید اور مضر قوتیں اس کی رہنمائی کرتی ہیں جن کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کے کاروبار انجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ کھیل کود کے ذریعے، زیادہ تجربہ کار ساتھیوں کی تھوڑی سی ہدایت اور زیادہ تر جبلتوں کی بدولت اپنے ماحول کو سمجھ لیتا ہے ۔ خوراک تلاش کرنا، رہنے کے لیے گھر بنانا، دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے اپنی حفاظت کرنا، اور بقائے نسل کے فرائض انجام دینا جو بالعموم اس کی زندگی کا شغل ہوتا ہے وہ بچپن کا مختصر دَور ختم کر کے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتا ہے ۔ اس کے بالکل برخلاف انسان کے بچے کی حالت ہوتی ہے ۔ پیدایش کے وقت وہ بالکل بے بس ہوتا ہے چونکہ اپنی بنیادی ضرورت کی تکمیل اور اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اس لیے ہر قدم پر ماں یا دوسرے افراد خاندان کا سہارا ضروری ہے ۔ انسان کے لیے بچپن کا زمانہ دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے جس سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن کا یہ طویل زمانہ اکارت گیا کیونکہ اس دَور میں بچہ کسی سماجی مشاغل میں حصہ نہیں لے سکتا ۔ لیکن انسان کے بچپن کے دور کا طویل ہونا عین مصلحت ہے ۔ جانوروں کے لیے مختصر سا بچپن ان تمام مشاغل کو سیکھنے کے لیے کافی ہے جن کو ان سے سابقہ پڑنے والا ہوتا ہے اور اس عرصے میں وہ اپنے کم و بیش محدود اور معیّن ماحول کی ضروری چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں ۔ انسان کی حالت اس سے مختلف ہے ۔ اس کے لیے اکتساب (learn-ing) کا دور نہ معیّن ہے اور نہ محدود ۔ اسے اپنے غیر محدود، تغیر پذیر اور نمو پذیر ماحول سے

مطابقت پیدا کرنے کے لیے گذشتہ پیڑیوں کے صدیوں کے تجربوں کو سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے طویل مدّت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو ترتیب اور تعلیم کا بہترین زمانہ ہوتا ہے مقابلتاً طویل رکھا ہے۔

غرض سماجیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہم کو اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارے سامنے ایک طرف تمدّن ورثہ ہے اور دوسری طرف ایک حیاتیاتی عضویہ۔ سماجیت کا طریق اسی اہم نکتے پر بحث کرتا ہے کہ اس حیاتیاتی عضویے میں تمدّنی ورثے کو کس طرح منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اس کی ذمّہ داری کن ایجنسیوں کے تفویض کی جاتی ہے؟ اور فرد جب سماج کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو وہ ارادی اور غیر ارادی طور پر اکتساب (learning) اور تقلید (immitation) کے ذریعے کس طرح سماج کے مروّجہ افعالی نمونوں کو اپناتا ہے؟

تمدّن کو منتقل کرنے کا اہم ذریعہ بین عمل یا interaction ہے۔ بین عمل کی وجہ سے ربط (contact) اور ارتسال (Communication) عمل میں آتا ہے۔ ربط اور ارتسال جتنا زیادہ مکمّل اور بامعنی ہوتا ہے اتنی ہی آسانی کے ساتھ تمدّن کی منتقلی عمل میں آئے گی۔ تمدّن دراصل ہنر، عقیدوں، معلومات اور ان تمام حاصلات (products) کا مجموعہ ہوتا ہے جس کی مشترک حصّہ دار افراد کی ایک بھاری تعداد ہوتی ہے اور اسے اپنے بچّوں میں منتقل کرتی ہے۔

"Culture consists of the sum total of skills, beliefs, knowledge and products that are commonly shared by a number of People and transmitted to their children."

سماجیت کا طریق سماجی تعلّقات پر مبنی ہے۔ ربط اور ارتسال کی وجہ سے شعور اجاگر ہوتا ہے اور شعور کی بناء پر فرد اس امر کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کے افعال و اعمال یا طور طریقے دوسروں سے کس حد تک یکساں اور کس حد تک مختلف ہیں؟ مختلف تجربوں سے گزرنے کی وجہ سے اسے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے احساسات اور جذبات بھی کس حد تک دوسروں سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں فرد کو نہ صرف اپنی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس میں ہم جنسی شعور (Consciousness of Kind) بھی پیدا ہوتا ہے۔

ہوورڈ بیکر (Howward Becker) کا خیال ہے کہ سماجیت کے طریق کی وجہ سے

بچے نہ صرف ایک روٹین (routine) کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کے افعالی نمونوں کی تقلید بھی کرتے ہیں جو سماجی بین عمل کے وقت ان کے مشاہدوں سے گزرتے ہیں۔

سماجیت کے دور کو ٹالکٹ پارسن (Talcot Parson) زندگی کے کسی ایک دور سے مختص نہیں کرتے بلکہ اُن کا کہنا ہے کہ یہ وہ طریق ہے جو زندگی بھر جاری رہتا ہے کیونکہ ماں باپ، اُستاد، دوست احباب، عزیز و اقارب، بیوی بچوں، ہمسایہ، آفیسر، ماتحت، نوکر وغیرہ سے افراد کا ربط مراسم کی کسی نہ کسی سطح پر برقرار رہتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے مختلف دوروں میں اکتساب کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور افراد کو بدلتی ہوئی سماجی قدروں اور معیاروں کے مطابق اپنے افعال و اعمال میں ردو بدل کرنا پڑتا ہے اس لیے وقت، سماجی حالات اور عمر کے لحاظ سے تبدیلی کی رفتار کبھی تیز ہوتی ہے اور کبھی اتنی سُست کہ زندگی ایک نہج پر گزر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بچپن، سیانپن، نوجوانی اور جوانی میں نسبتاً زیادہ سرعت اور خوشگواری سے ساتھ سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت کر لیتے ہیں بہ نسبت ادھیڑپن اور بڑھاپے کے۔ یہ دراصل عمر کے تقاضے ہوتے ہیں کیونکہ کم عمری میں مطابقت کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ یہ لچک بھی کم ہوتی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سماجیت کا طریق زندگی کے صرف ابتدائی تشکیلی دور تک محدود ہے یہ خیال اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ بچہ ابتدائی عمر میں تجربات کی جن مختلف منزلوں سے گزرتا ہے وہ تمام عمر اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اب بھی روایتی سماجوں (traditional societies) کی حد تک اس بیان میں صداقت کی گنجایش ہے کہ بچپن میں جو بھی پیشہ سکھایا جاتا ہے وہ مستقبل کا محافظ ہوتا ہے لیکن ایک متحرک سماج (dynamic Society) میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فرد بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے ایسی تبدیلی کرے جو سماجی تقاضوں کو پورا کرنے میں اس کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ اس موجودہ زمانے میں بالغ سماجیت (adult Socialization) بہت زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ چونکہ ہمعصر سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں اور مقابلے کا عنصر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اس لیے افراد سماجی سیڑھی (social ladder) کے اونچے زینوں پر پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے متعلقہ شعبے میں مہارت ہی نہیں بلکہ فوق مہارت (Super Specialization) حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے لیے انھیں بڑی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ بڑی نفسی اور ذہنی کشمکش

میں مُبتلا رہتے ہیں ۔ بہتر معاشی ذریعوں کی تلاش میں اُنھیں ہزاروں میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے پھر نئے سماجی حالات اور نئی سماجی قدروں سے ہم آہنگی پیدا کرنی ہوتی ہے ۔ باز سماجیت (re-socialization) کا ابتدائی دور بڑا صبر آزما اور سخت آزمائشوں میں مُبتلا کرنے والا ہوتا ہے ۔ ماہرینِ سماجیات کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں سماجی حالات کے تیزی سے بدلنے کی وجہ سے باز سماجیت کا طریق بہت اہم ہو گیا ہے، کیونکہ ابتدائی عُمر میں جب افراد سماجیت کے طریق سے گزرتے ہیں تو وہ افعالی نمونوں کو ارادی اور غیر ارادی طور پر تقلید کے ذریعے سیکھتے جاتے ہیں جن کو اپنانا ان کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا ۔ اس کے برخلاف جب ارادی طور پر افراد کو باز سماجیت کے طریق سے گزرنا پڑتا ہے تو ان کے نفس اور ذہن پر اکثر و بیشتر صورتوں میں بڑا بار گزرتا ہے ۔

سماجیت کی ایجنسیاں : AGENCIES OF SOCIALIZATION

سماجیت کی مختلف تعریفوں اور اس طریق کی تشریح سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ہر بچّہ صرف چند بنیادی ضرورتوں اور جبلتوں کے ساتھ وجود میں آتا ہے ۔ اس حیاتیاتی عضویے کو سماجی عضویے میں تبدیل کرنے کے لیے سماجی ورثے کی مُنتقلی ضروری ہے جس میں مختلف گروہوں، اداروں، تنظیموں اور افراد کا تعاون حاصل رہتا ہے جو ارادی اور غیر ارادی طور پر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ بچّے کی تربیت اور تعلیم اس طرح ہوتی رہے کہ وہ سماجی توقعات کے مطابق عمل کر کے خود اپنے لیے، اپنے خاندان اور سماج کے لیے بہتر ہستی ثابت ہو سکے ۔ غرض وہ تمام ذریعے جن سے تمدّن کی منتقلی (transmission of culture) عمل میں آتی ہے سماجیت کی ایجنسیاں کہلاتی ہیں ۔

ان ایجنسیوں کی نوعیت سماجی ساخت اور فعلیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے ۔ ایک متحرک، شہری اور ترقّی یافتہ سماج میں چونکہ سماجی بین عمل کا دائرہ انتہائی وسیع ہوتا ہے اس لیے وہ مختلف النوع ذریعوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ دیہی اور قبائلی سماج میں سماجی بین عمل کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے سماجیت کی ایجنسیاں بھی گنی چُنی ہوتی ہیں ۔

زندگی کے مختلف دَور میں سماجیت کی ایجنسیاں مختلف ہوتی ہیں مثلاً بچپن میں ماں باپ، بھائی بہن، نوکر چاکر، عزیز و اقارب، خاندان اور محلّے کے ہم عمر بچّے، مدرسہ، اُستاد، ہم جماعت،

بچکانی فلم، کہانیوں کی کتابیں، تصویریں وغیرہ سوچ بچار کے طریقوں، آپسی میل ملاپ اور طرزِ برتاؤ پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔

نوجوانی کے دور میں ماں باپ اور بچوں کے درمیان کچھ فصل پیدا ہو جاتا ہے۔ تعلقات میں تکلفانہ عنصر شامل ہو جاتا ہے اس لیے اس عمر میں لڑکے اور لڑکیاں ماں باپ سے زیادہ اپنے دوستوں سے بے تکلفانہ بات چیت کے ذریعے اپنی نفسی اور ذہنی کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ غرض اس دَور میں ماں باپ اور بھائی بہن کے اثرات زائل نہیں ہوتے بلکہ کسی قدر کم ہو جاتے ہیں۔ دوست احباب کے علاوہ مختلف تعلیمی گروہ، سیاسی تنظیمیں، تفریحی انجمنیں اندازِ فکر پر اپنا گہرا اثر مترتب کرتی ہیں۔ اس دور میں کالج، اُستاد، فلم، ناول، رسالے، گانے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی براہِ راست اور بالواسطہ اثرانداز ہوتے ہیں۔

جوانی کے دَور میں ملازمت سے وابستگی کی وجہ سے آفیسر اور ماتحت کے تعلقات اور دفتر یا کاروباری اداروں کے پیچیدہ نظام، شادی کے بعد ازدواجی تعلقات کی نوعیت، بچوں اور گھر سے وابستگی، رہائش کا طریقہ، سُسرالی اثرات، دوست احباب، تفریحی موقع، مذہبی رجحانات وغیرہ سے مختلف النوع تجربے حاصل ہوتے ہیں جن کی بنا پر افراد کو اپنے سماجی ماحول سے مطابقت کرنی پڑتی ہے۔

بڑھاپے میں مطابقت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جسمانی اعضا کے مضمحل ہونے، زندگی کے ساتھی کے چھوٹ جانے یا بیماری میں مُبتلا رہنے، اولاد کے دُور ہونے، ان کے حسنِ سلوک یا لاپروائی، زندگی میں کسی وجہ سے محرومیت کے احساس وغیرہ کی وجہ سے افراد کی نفسی اور ذہنی کیفیتیں مختلف روپ اختیار کرتی ہیں جس کا اظہار ان کی بات چیت سے بآسانی ہوتا ہے۔

اس طرح زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف افراد اور گروہوں سے سماجی بین عمل جاری رہتا ہے اور افراد کو سماجی تعلقات کے مطابق زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ مطابقت کبھی خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے اور کبھی بارِ خاطر ہوتی ہے لیکن پھر بھی اکثر و بیشتر افراد اپنے طریقوں میں اس طرح ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں کہ زندگی چین و آرام سے گزر سکے۔

خاندان:

ہر بچہ کی پیدائش ایک سماجی ماحول میں ہوتی ہے اور اس ماحول کا اثر بچے کی نشو و نما

پر بہت زیادہ پڑتا ہے اس لیے بچّے کی صحت مندانہ نشوونما میں جتنی اہمیت معقول غذا، مناسب لباس، موزوں جائے رہائش اور طبّی سہولت کی ہوتی ہے اتنی ہی اہمیت محبّت آمیز نگہداشت، جذباتی لگاؤ اور تحفّظ کی۔

سماجی ماحول سے متعلق بچّوں کے تجربوں کی ابتدا خاندان سے ہوتی ہے اور خاندان کی بنیاد اس فطری محبّت پر قایم ہے جو قدرتاً والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے جس کا اظہار حیوانوں کی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ ہر بچّہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ بالکلیہ والدین کی خبر گیری اور نگہداشت کا محتاج ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کے بچّے کی محتاجی (dependency) اور خبر گیری کا دور نسبتاً طویل ہوتا ہے اس لیے ان کی مستقل نگہداشت کا انتظام کرنے کے لیے قدرت نے والدین میں محبّت کا جذبہ ودیعت کیا ہے جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کی تکلیفیں جھیل کر بچّے کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور آرام پہنچائیں۔ بنی نوع انسان کی زندگی کو قایم رکھنے کے لیے قدرت کا یہ انتظام ناگزیر ہے، لیکن خاندانی زندگی کا محض یہی فائدہ نہیں ہے کہ بچّوں کی پرورش کی جائے اور ایک پیڑھی دوسری پیڑھی کی بقا کا انتظام کرے بلکہ سماجی زندگی میں ہمیشہ یہ اصول کارفرما رہتا ہے کہ جب کوئی ادارہ کسی خاص مقصد کے لیے مختص ہو جاتا ہے تو ارتقا کے مختلف درجوں سے گزرنے کی وجہ سے اس کے ذمّے مختلف فرائض (functions) ہو جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے پُرانے فرائض اپنی افادیت کھو دیتے ہیں اور نئے فرائض کی تکمیل ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے خاندان جو ابتدا میں محض بچّوں کی جسمانی نگہداشت کا ذمّہ دار تھا رفتہ رفتہ ان کی معاشی، اخلاقی، مذہبی، تعلیمی اور تفریحی تربیت اور رہنمائی کا گہوارہ بھی بن گیا۔ غرض خاندان کے فرائض مختلف النوع اور ہمہ گیر ہو گئے۔ اب خاندان کا فرض یہی نہیں رہا کہ حیاتِ موجودہ کو قایم رکھا جائے بلکہ ہر خاندان کی یہ آرزو رہتی ہے کہ حیاتِ برتر کی تشکیل ہو۔ چونکہ شخصیت کی نوعیت پیدایشی اور جبلی نہیں ہوتی جو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہو بلکہ اکتسابی یعنی acquired ہے لہٰذا ہر خاندان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اس سے متعلّقہ افراد کی شخصیت کی اس طرح تشکیل ہو کہ وہ نہ صرف اپنے خاندان کے بہترین ذہنی، اخلاقی، تمدّنی اور مذہبی سرمائے سے مُستفید ہوں بلکہ اپنی نجی جد و جہد، علم اور فن اور منظّم کوششوں اور مہارت کے ذریعہ اپنی مخفی صلاحیتوں کو اس طرح پروان چڑھائیں کہ ان کا وجود خاندان کے لیے باعثِ فخر ہو اور وہ اپنے والدین سے زیادہ اونچی سماجی حیثیت حاصل

کرسکیں۔

اب رہا یہ اہم سماجیاتی نکتہ کہ خاندان کس حد تک بچّے کی طبیعت اور خیالات پر خوشگوار اثرات مرتب کرسکتا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے یہ ہوگا کہ گھر کی فضا جتنی زیادہ مسرت بخش ہوگی، افرادِ خاندان میں ایک دوسرے کے خیالوں اور رجحانوں کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور ہمدردی برتنے کا جتنا زیادہ احساس رہے گا، بھائی بہنوں میں جتنا زیادہ پیار و محبّت اور تعاون کا خیال ہوگا۔ والدین کی شخصیت میں جس قدر زیادہ توازن ہوگا وہ بچّے کی اس طرح تربیت کریں گے کہ نہ تو وہ بے جا لاڈ پیار سے ضدّی اور ہٹیلا ہوجائے اور نہ سختی کی وجہ سے بچّے کی آزاد رائے اور خود اعتمادی کا جذبہ مجروح ہوجائے۔ غرض خاندان کے مختلف افراد اپنے طرزِ عمل اور مثال کے ذریعے بچّوں پر اس طرح اثر انداز ہوسکتے ہیں کہ شروع ہی سے تخریبی رُجحانوں کی پرورش نہ ہو ورنہ جب بچّے کی تربیت کی بُنیاد ہی کمزور ہو تو اس پر جو عادت کھڑی ہوگی اس کے استحکام کی توقّع کرنا ہی خیالِ خام ہوگا۔ فارسی کے اس شعر کے مصداق

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی جب معمار پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھے تو یہ عمارت چاہے ثریا ہی تک کیوں نہ پہنچ جائے اس کی دیوار ٹیڑھی ہی رہے گی۔

بچّے کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے یوں تو سب ہی افرادِ خاندان ہوتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ رول والدین کا ہوتا ہے اور والدین میں بھی بطورِ خاص "ماں" کی زبردست اہمیت ہے۔ اسی لیے یہ مقولہ زبان زدِ خاص و عام ہے کہ "جو ہاتھ جھُولا دیتا ہے وہ حکمرانی کرتا ہے"۔

اگر ماں فہمِ عامہ کی حامل ہو۔ اس کی نگاہ دور رس ہو اور اچھی نباض ہو تو وہ بچّے کی معصومانہ ترکتوں، اس کے کھیل کود کے طریقوں اور آپسی برتاؤ کو دیکھ کر اس کے نفسی اور ذہنی رُجحانوں کے بارے میں پیش قیاسی کرتے ہوئے اس نرم و نازک ڈالی کو اس طرح جھکانے کی کوشش کرتی ہے کہ بچّہ کے جذبۂ نازک پر وہ بار نہ بنے۔ وہ اپنے حسنِ سلوک، کہانیوں، نظموں اور حکایتوں کے صحیح انتخاب، موزوں مثالوں کے ذریعے آہستہ آہستہ لیکن بتدریج اعلا اقدار کی پرورش

کرتی ہے۔کسی زبان میں بھی سبق آموز کہانیوں، اور دل لبھاؤ نظموں کی کمی نہیں۔ اور موجودہ زمانے میں تو بچکانی ادب پر انتہائی دلچسپ انداز میں اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اگر بچّے کی اِفتادِ طبع کو مدِّ نظر رکھ کر ان کا صحیح انتخاب کر لیا جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ مُفید اور عُمدہ عادتوں اور رُجحانوں کو بطور سرمائے کے بچّوں میں آسانی سے منتقل کر دیا جاسکتا ہے جس کا سود عمر بھر ملتا رہے گا۔

موجودہ زمانے میں بچوں کی پرورش اور نگہداشت جو ماں کا اہم اور بُنیادی فرض سمجھا جاتا ہے وہ ترقّی یافتہ ملکوں میں نیم سرکاری اور خانگی اداروں کے تفویض کیا جارہا ہے جن میں ڈے نرسری (day nursaries)، کریشیس (Creches)، بے بی سٹنگ (baby - Sitting) اور بورڈنگ ہاؤز (Boarding House) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ادارے اپنے تفویض شُدہ کام کو کتنی ہی مہارت سے کیوں نہ انجام دیں ان میں فطری لگاؤ اور قدرتی محبّت کے جذبے کے فقدان کی وجہ سے وہ کبھی بھی خاندان کا بدل یا Substitute نہیں ہوسکتے۔ ان سے اس والہانہ لگاؤ اور پُرخلوص سلوک کی توقّع ہی نہیں کی جاسکتی جو ایک نمو پذیر شخصیت کے لیے ناگزیر ہے اور جس سے غفلت برتنے کا نتیجہ کئی بچوں کے نفسی اور ذہنی انتشار کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل پھر یہ رُجحان پروان چڑھ رہا ہے کہ مائیں کم از کم اس مدّت تک مُلازمت یا کسی پیشہ کی ذمّہ داری قبول نہ کریں جب تک کہ بچّہ اسکول جانے کے قابل نہ ہو جائے۔

والدین کے علاوہ بچّوں کو تمدّنی نمونوں سے متعلق مزید ارتسال (Communication) اپنے بڑے بھائی بہنوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو سماجیت کے طریق کے ابتدائی دَور سے گزر چُکے ہوتے ہیں اور جو والدین، عزیز واقارب اور دوست احباب سے متاثر ہوچُکے ہیں۔ وہ اپنے تجربوں کی بناء پر اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو روکتے ٹوکتے، ہدایتیں دیتے اور اپنی سمجھ بُوجھ کے موافق ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

ہم عُمر گروہ: PEER GROUP

عُمر کے کچھ اضافے کے ساتھ بھائی بہنوں اور والدین کے مقابلے میں ہم عُمر دوستوں، ہم جماعت لڑکے لڑکیوں اور کھیل کُود کے ساتھی وغیرہ جسے Peer group کہا جاتا ہے ان سے بچّے کا ربط بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور فوقانی درجے پر پہنچنے تک اکثر و بیشتر بچّے ماں باپ

اور بھائی بہنوں کی رائے کے مقابلے میں دوستوں اور دوستوں کے افرادِ خاندان کے طور طریقوں کو قبول کرتے اور ان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال شہری سماجوں اور ترقی یافتہ ملکوں میں بہت زیادہ واضح ہے یہاں تک کر teen-age میں ماں باپ اور بچوں میں غلط فہمیاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں جو ایک دوسرے کے خیالوں اور جذبوں میں عدم توازن کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لیے والدینی تمدّن یعنی Parental culture کے مقابلے میں دوستانہ تمدّن یعنی Peer Culture کا اثر بچّوں کی عادتوں اور طرزِ برتاؤ میں بہت زیادہ غالب رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ گھر کو ایک پارکنگ پلیس (Parking Place) اور فلنگ اسٹیشن (Filling Station) سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ ایسے نازک موڑ پر یہ سمجھ کر کہ "کنول کی جڑ بھی کیچ میں ہوتی ہے" بچوں کی طرف سے غفلت برتنا یا انجان ہو جانا مستقبل کے لیے ایک دائمی پچھتاوا بن جاتا ہے۔

درس گاہیں:

والدین اور دوست احباب ہی سماجیت کی واحد ایجنسیاں نہیں ہیں بلکہ درس گاہیں بھی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں۔ اگر خاندان غیر رسمی طور پر تمدّن کی منتقلی کا کام انجام دیتا ہے تو اسی فرض کو نرسریز، اسکول، کالج اور یونیورسٹی رسمی طور پر انجام دیتے ہیں۔

تعلیم سے مُراد محض علم سکھانا نہیں ہے بلکہ یہ لفظ مجموعی تربیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب انسان کی مخفی صلاحیتوں کو اُبھارنا اور منظّم کرنا ہے۔ واقفیت اور علم میں اضافہ کرنا تو آسان ہے لیکن طالب علموں کے ذوق اور شوق کو اُبھارنا، ان کے جذبوں اور خواہشوں کو ایک عُمدہ اور اعلا نصب العین کے تحت تربیت دینا اور انھیں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے صحیح استعمال کی رہنمائی کرنا انتہائی دُشوار کام ہے۔ لیکن یہ کام دُشوار ہونے ہوئے انتہائی ناگزیر ہے، کیونکہ درس گاہوں سے بہتر اور برتر انسان کی تشکیل کی توقّع کی جاتی رہی ہے۔ ورنہ طالب علموں میں معلومات کا ایک جامد اور بے روح مجموعہ منتقل کرنا تعلیم کے مقصد کی نفی کرتا ہے۔ طالب علموں میں علم کا صحیح ذوق پیدا ہونے نہیں پاتا اور ان کے لیے درس گاہوں کو جانا اور آنا ایک روٹین (routine) بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کئی سماج دُشمن عناصر (anti social elements) ان کی توجّہ اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔

تعلیم کے اس غیر افادی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ماہرینِ تعلیم نے بارہا ایسے نصاب کی تدوین کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا قریبی ربط زندگی کے مختلف شعبوں سے رہے۔ اس اہم فرض کے پیشِ نظر درس گاہیں سماجیت کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتی ہیں جو جدید علوم و فنون کی منتقلی کے ساتھ ساتھ نئی پیڑی کی دماغی نشو ونما اور شخصیت کی تشکیل کے ذریعے انہیں بہتر طور پر سماجی زندگی میں حصّہ لینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔ بچّوں اور نوجوانوں کا چونکہ زیادہ وقت اور زندگی کا بہترین حصّہ درس گاہوں میں صَرف ہوتا ہے اس لیے درس گاہوں کا تمدّن یعنی اسکول یا کالج کا اقتداری نظام، دفتریت، اُستادوں کا طالب علموں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کے پڑھائی کا طریقہ، پیشے سے انہماک اور دلچسپی، طالب علموں کی ضرورتوں کو سمجھنے کی صلاحیت، طالب علموں کی نفسی، دماغی اور کھیل کود کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر ان کو پروان چڑھنے کے بہترین مواقع وغیرہ ایسے اہم عناصر ہوتے ہیں جو ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے ضامن ثابت ہوتے ہیں۔ سماجیت کے طریق کے اعتبار سے دس پندرہ سال کا یہ طویل عرصہ جو درس گاہوں کی نذر ہوتا ہے اس میں اُستاد کی حیثیت ایک نمونے یا ماڈل کی سی ہوتی ہے جس کی شخصیت کے ہر پہلو سے طالب علم متاثر ہوتے ہیں۔ غرض طالب علموں میں علم اور فن کو جاری رکھنے یا منقطع کر دینے کا دار و مدار ان ہی خیالوں کے پسِ منظر میں تشکیل پاتا ہے۔ اگر درس گاہیں اس مقصد کو پورا کرنے میں عہدہ برآنہ ہوں تو جس بے دلی سے اُستاد انہیں پڑھائیں گے اُسی بے دلی سے طالب علم انہیں سُنتے رہیں گے اور اکثر و بیشتر بغیر سوچے سمجھے محض امتحان پاس کرنے کے لیے رٹ لیتے ہیں۔ طالب علموں کی یہ بے رُخی اور عدم توجہی ہمّت شکن نتیجوں میں ظاہر ہونے کی وجہ سے موجودہ زمانے میں والدین اور اُستادوں (Parent - teacher association) کی مشاورتی کمیٹیوں اور انتظامی امور میں طالب علموں کی نمایندگی کے لیے ان کے مُنتخب نمایندوں کو رکھا جاتا ہے تاکہ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں اور تعلیمی ڈھانچے میں عدم مطابقت نہ رہے۔

سماجیت کے نظریے THEORIES OF SOCIALIZATION

سماجیات اور نفسیات کے ماہروں نے سماجیت کے طریق کی وضاحت کے سلسلے میں چند نظریے پیش کیے ہیں اور اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ چند مخصوص نفسی اور سماجی رُجحانوں کے تحت افراد سماج کے مروجہ طریقوں کو اپناتے ہیں۔ اس سلسلے میں چار نظریے بہت اہم ہیں۔

۱: درکھائم کا نظریۂ اجتماعی نیابت:

(DURKHEIM'S THEORY OF COLLECTIVE REPRESENTATION)

سماجیت کے طریق کی تشریح فرانسیسی ماہر سماجیات امائیل درکھائم (Emile Durkheim-1817-1858) نے "نظریۂ اجتماعی نیابت" کی رُو سے کی ہے۔ اس نظریے کے مطابق یہ خیال کرنا ہی غلط ہے کہ فرد سوچتا ہے۔ درکھائم سماجی قوتوں (Social forces) پر زور دیتا ہے اس لیے اس کا کہنا ہے کہ فرد نہیں سوچتا بلکہ اس کے خیالوں، رایوں، عقیدوں اور قدروں پر سماج کی مہر ثبت رہتی ہے کیونکہ یہ تمام سماجی عناصر سماجی گروہ کی پیداوار ہیں۔ فرد جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جن لوگوں سے ربط میں آتا ہے وہ سب اس کے اندازِ فکر کا تعین کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے درکھائم کے پاس انفرادی نفسیات یا Individualistic Psychology کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لیے پروفیسر چارلس اے ایل وڈ (Charles A-Ellwood) درکھائم کے بارے میں یہ کہتے ہیں:

> *"Durkheim's system is a system of social determinism that leaves little or no place for the creativity of the human individual."*
>
> یعنی "درکھائم کا سسٹم سماجی جبریت کا سسٹم ہے جس میں فرد کی تخلیق کے لیے تھوڑی سی یا کوئی گنجایش نہیں"۔

سماجیات میں سماجیت کے طریق کی وضاحت کے بارے میں درکھائم کا نظریۂ اجتماعی نیابت بہت اہم ہے۔ درکھائم کا خیال تھا کہ گروہی فکر کے بین عمل سے علامتیں (Symbols) بنتی ہیں اور ان اجتماعی علامتوں (Collective symbols) میں بڑی زبردست قوت ہوتی ہے کیونکہ ان کی تخلیق اور نشوونما اجتماعی غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر کسی ملک کا جھنڈا وہاں کے سیاسی رُجحانوں اور مسلکوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ مقدس تحریریں اور علامتیں مذہبی رُجحانات کی عکاسی کرتی ہیں سورماؤں سے جو معجزاتی قوتیں وابستہ کی جاتی ہیں وہ اجتماعی غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ اس اجتماعی نیابت میں بڑی زبردست سماجی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ اتحاد اور تعاون کے جذبوں کو اُبھارتی، تصادم اور نزاعوں کو روکتی ہیں۔ غرض درکھائم کا نظریۂ

اجتماعی نیابت سماجی قدروں کی نشاندہی کرتاہے۔ سماجی قدریں اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ انفرادی عمل کا، اسی لیے افراد انھیں غیرارادی طور پر قبول کرتے جاتے ہیں۔ درکھائم کا یہ جملہ کہ

"The individual soul is but a microscopic reflection of the social world."

یعنی "انفرادی روح (نفس) یا فرد سماجی دُنیا کا ایک خوردبینی عکس ہے"۔

فرد کی اہمیت کو گھٹا دیتاہے۔ اس نظریے کا لب ولباب یہ ہے کہ خیالات کا وہ مجموعہ، افعال و اعمال کے وہ نمونے، رُجحانات اور قدریں جو کسی گروہ میں قابلِ قبول ہوں اور جنھیں گروہ کی تائید حاصل ہو انھیں فرد اس طرح اپناتاہے کہ وہ اس کی سماجی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے شخصیت کی تشکیل میں سماجی دباؤ کا زبردست حصّہ ہوتاہے اور انفرادی قوتوں اور انفرادی فکر کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

2: کولی کا نظریۂ آئینۂ ذات:

COOLEY'S THEORY OF LOOKING-GLASS SELF

چارلس ہرٹن کولی (Charles Horton Cooley-1864-1929) امریکی ماہر سماجیات تھا جس نے سماجیت کے طریق کی تشریح کے سلسلے میں آئینۂ ذات کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریے کو سمجھنے کے لیے ذات یا Self کا ایک واضح تصوّر ضروری ہے۔

"The self consists of all ideas and feelings the individual associates with the words "I", "Me", "My" and "Mine."

یعنی "ذات کا انحصار ان تمام خیالوں اور احساسوں پر مشتمل ہے جو فرد "میں" "مجھ کو" "میرا" اور "میرا اپنا" جیسے الفاظ سے وابستہ کرتاہے"۔

مارٹن ڈیل (Martin Dale) نے ذات کی تشریح یوں کی ہے:

"The self consists of those things an individual conceives as belonging peculiarly to him."

یعنی "ذات کا انحصار ان تمام چیزوں پر ہے جن کے متعلق فرد یہ سمجھتا ہے کہ وہ خاص طور پر اس کی ہیں"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کے خیالات اور احساسات سب کے ہوتے ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جائے گا کیونکہ صرف ان چند مستثنیات کے جو پاگل پن کی وجہ سے اپنے وجود سے واقف نہ ہوں ہر نارمل انسان میں جبلی طور پر احساسِ ذات موجود رہتا ہے۔ لہٰذا ہر انسان کے دماغ میں اس کا اپنا تصوّر ہوتا ہے اور وہ اپنے بارے یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اسی احساس کی بنا پر وہ اپنے اور دوسروں کے بارے میں فرق بھی کر سکتا ہے؟ اور اپنا تعارف دوسروں سے کرا بھی سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنی ذات کے احساس کو کھو دیتا ہے تو ظاہر ہے وہ ان گنت اُلجھنوں اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر سے اپنی نشان دہی کروانے کے لیے اپنی کھوئی ہوئی حالت کو حاصل کرنا چاہتا ہے چنانچہ:

"A conception of self is essential to the individual's understanding of other people in his environment. and his relation to them."

یعنی "فرد کے لیے اپنے ماحول اور دوسرے لوگوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ذات کا تصوّر ضروری ہے"۔

جب فرد کی یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اور کیا کر رہا ہے؟ تب ہی اس کا برتاؤ سماجی کہلا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد کو "میں"، "میرا"، "مجھ کو" اور "میرا اپنا" کا تصوّر کس طرح حاصل ہوتا ہے جس کی توضیح یوں کی جاتی ہے:

"A conception of self drives from social interaction and is essential fer continued social interattion and enactment of culture."

یعنی "سماجی بین عمل کے ذریعے ذات کا تصوّر اجاگر ہوتا ہے جو سماجی بین عمل اور تمدّن کے سلسلے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے"۔

ان بیانوں سے واضح ہے کہ ذات کا احساس دوسروں سے رابطہ میں آنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس احساس کے ساتھ بین عمل کا طریق اور زیادہ بامعنی اور اثر انگیز ہو جاتا ہے۔ جس

کی بنا پر دوسروں کی توقعات کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غرض اس تصوّر کے ساتھ ہی فرد اپنی ذات کو دوسروں کے تعلق سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے بچّوں، طالب علموں اور لیڈر کے تصوّر پر غور کیجیے۔ بچّوں کا وجود والدین کے بغیر ممکن نہیں، طالب علموں کا وجود اُستادوں کے بغیر ناممکن ہے اور لیڈر کا وجود معتقدین کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا کسی سماجی ہستی کا تصور بغیر دوسری سماجی ہستی کے ناممکن ہے۔

اب کولی کے نظریے پر غور کیجیے جس کی تشریح یہ ہے کہ انسانی فطرت (human nature) کی تشکیل سماج کے دوسرے افراد سے ربط میں آنے کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں کسی فرد کو اپنی ذات کا احساس اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ دوسروں سے ربط میں نہیں آتا اور جب تک اسے دوسروں کے خیالوں، رُجحانوں، عقیدوں اور رسم و رواج سے واقفیت نہیں ہوتی۔ اس لیے کولی سماجی ذات (Social-Self) کی تشریح اس طرح کرتا ہے۔

"Any idea, or system of ideas, drawn from the communicative life, that the mind cherishes as its Own."

یعنی "کوئی خیال یا خیالوں کا نظام جو ارتسال کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور جسے ذہن اپناتا ہے۔"

غرض کولی کا کہنا ہے کہ سماجی ذات (Social Self) کی نشو و نما احساس ذات (Self feeling) کی وجہ سے ہوتی ہے جس کی نوعیت جبلی ہوتی ہے۔ اور جو مختلف قسم کی جدو جہد کی محرّک اور مخصوص جدو جہد کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ فرد اس ذات کا اظہار "میں"، "مجھ کو"، "میرا" اور "میرا اپنا" الفاظ کے ذریعے کرتا ہے۔ اس طرح ہر فرد کو اپنی ذات کا احساس دوسروں سے ربط میں آنے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ غرض ہر فرد اپنی ذات کو سماجی اقدار اور معیاروں کے آئینہ میں دیکھتا ہے جس کو کولی آئینہ ذات (Looking-glass Self) کہتا ہے۔ کولی کے اس نظریے کے تین اہم اجزاء ہیں:

(1) دوسروں کی نظر میں اپنی ذات کا تصوّر کیا ہے؟

(2) دوسروں کی رائے اس تصوّر کے بارے میں کیا ہے؟

(3) ان دونوں احساسوں کے بعد آیا فرد میں فخر کا احساس اجاگر ہوتا ہے یا شرمندگی کا!

مختصر یہ کہ سماجی زندگی گزارنے اور سماج کے دوسرے افراد سے ربط قایم ہونے کی وجہ سے انفرادی شعور اور سماجی شعور بیدار ہوتا ہے۔ لہٰذا کولی اس امر پر زور دیتا ہے کہ سماجی ذات (Social self) کی نشوونما احساس ذات (Self feeling) کی وجہ سے ہوتی ہے جس کا دار و مدار جبلت پر ہوتا ہے یا بالآخر فرد اس کا اندازہ لگالیتا ہے کہ دوسرے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

سماجیاتی ادب میں کولی کی اہمیت محض آئینہ ذات کے نظریے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ اس نظریے کی بنا پر سماج کا ایک نظریہ (Theory of Society) مرتب کرتا ہے اور فرد کے اس افعال و اعمال سے وہ سماجی گروہوں اور سماجی تنظیم کی وضاحت کرتا ہے۔

3: میڈ کا نظریۂ شعورِ ذات:

MEAD'S THEORY OF SELF. CONSCIOUSNESS

جارج ہربرٹ میڈ (George Herbert Mead 1863-1937) امریکہ کا ماہر سماجیات تھا جس نے سماجیت کے طریق کی تشریح کے لیے شعورِ ذات کا نظریہ پیش کیا ہے۔

کولی اور میڈ کے نقطۂ نظر میں اس طرح فرق پایا جاتا ہے کہ کولی احساس ذات یا Self feeling کو جس کی بنیاد جبلت پر ہے سماجیت کی اساس قرار دیتا ہے جب کہ میڈ کا کہنا ہے کہ سماجی بین عمل کی وجہ سے ذات کی نشوونما ہوتی ہے جس میں شعور کا دخل ہوتا ہے اس لیے میڈ کا خیال ہے کہ شعورِ ذات (Self - consciousness) کی وجہ سے افراد سماجیت کے طریق میں ڈھلتے ہیں۔

میڈ اپنے خیالوں کی تشریح کے لیے حیاتیاتی عضویہ (biological organism) اور سماجی شعور رکھنے والے فرد (socially self conscious individual) کی مثال دیتا ہے۔ حیاتیاتی فرد کے افعال و اعمال بالکلیہ جبلت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں استدلال اور عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا مثلاً بھوک کی جبلت سے مجبور ہو کر حیاتیاتی عضویے کسی نہ کسی طرح سے غذا حاصل کر لیتے ہیں جب کہ سماجی شعور رکھنے والا فرد ان طریقوں کو اپناتا ہے جس کی عقلی اور منطقی تاویل ممکن ہے۔ اس لحاظ سے انسان محض ایک حیاتیاتی عضویہ ہی نہیں بلکہ ایک ذی عقل ہستی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان دُہری زندگی گزارتا

ہے ایک جبلی اور دوسری عقلی بلکہ اس کی شخصیت میں جبلت اور استدلال کے عناصر ملے جلے ہوتے ہیں کبھی اس کے افعال و اعمال میں جبلت کا پہلو زیادہ نمایاں رہتا ہے تو کبھی استدلال کا۔ کبھی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب آجاتا ہے۔ اس طرح استدلال انسانی سعی و کوشش کی باز ساخت (re - structuring) کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک حیاتیاتی عضویے کی ضرورتوں کے پورا ہونے کا سوال ہے اس میں استدلال یا شعور کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ جبلت سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ان کے پیش نظر وقتی احتیاج کی تکمیل رہتی ہے۔

پیدائش کے وقت انسان کے بچے کی حیثیت محض ایک حیاتیاتی عضویے کی ہوتی ہے۔ وہ صرف چند بنیادی ضرورتوں اور جبلتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے لیکن پیدائش کے بعد اس کی حیاتیاتی جبلتوں (biological impulses) کو سماج کے مروجہ طریقوں کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ مختلف ترکات و سکنات، اشاروں، آوازوں اور الفاظ کے ذریعے بچوں کے ایسے طریقوں کو جو جبلت کا نتیجہ ہوتے ہیں آہستہ آہستہ لیکن تدریجی طور پر اس طرح بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ خاندان اور سماج کے ارکان کے لیے پسندیدہ ہوں۔ اس طرح شعوری اور ارادی طور پر سماجیت کا طریق عمل میں آتا ہے۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اسے دوسروں کی حرکتوں، ترجمانوں اور بات چیت کے ذریعے اس کا علم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں دوسروں کی کیا رائے ہے۔ اس اندازے کی بنا پر وہ اپنے افعالی نمونوں میں تبدیلی کرتا ہے۔ اس طرح ترکات و سکنات ارتسال یا Communication کا بنیادی ذریعہ ہیں جو اس کے جبلی افعال کی رہنمائی کرنے میں زبردست معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسروں کی رائے اس کے لیے با معنی ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کی ابرو پر بل آتا ہے تو اس کے معنی مطلب فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں جسے میڈ اہم حرکتیں اور علامتیں (important gestures and Symbols) کہتا ہے۔ اس طرح جن افراد میں بین عمل جاری رہتا ہے ان میں معنوں کا ارتسال بھی جاری رہتا ہے۔

معنی مطلب اور مقصد کو اظہار کرنے کا سب سے آسان اور عمدہ طریقہ زبان ہے میڈ کا کہنا ہے کہ زبان کی وجہ سے حیاتیاتی عضویے کو سماج کے مروجہ اور تسلیم شدہ طریقوں کے نتیجہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سماجی بین عمل میں سہولت ہوتی ہے اور سب سے اہم بات جس پر میڈ زور دیتا ہے وہ ذات یا Self کی نشو و نما ہے۔ میڈ کا کہنا ہے کہ ذات کا وجود

پیدائش سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ سماجی تجربوں اور سماجی جدوجہد کی وجہ سے ذات کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ذات کی وجہ سے انسان کو نہ صرف اپنا احساس ہوتا ہے بلکہ اس کو دوسروں کے وجود اور ان کی جدوجہد کا بھی علم رہتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے فرد دوسروں کا رول اختیار کرتا ہے جس کی بنا پر "Self hood" کا میکانزم تکمیل کو پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر کھیل میں بچہ دوسروں کا رول اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ ڈاکٹر بنتا ہے تو کبھی انجینئر، کبھی باپ تو کبھی اُستاد، کبھی پولیس کا آفیسر تو کبھی انجن ڈرائیور، کبھی کسی دُکان کا مالک تو کبھی میوزک ڈائریکٹر۔ غرض بچہ جو رول اختیار کرتا ہے اسی رول سے مطابقت کرنے والے حرکات و سکنات، آوازیں اور الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اسی وقت بچے کا جو رُجحان ہوتا ہے اسے میڈ "The generalized other" کہتا ہے۔

ذات کی تشریح کے سلسلے میں میڈ "I" اور "Me" کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ "I" دوسروں کے رُجحانوں کا جواب یا جوابی سلف (responding self) اور "Me" دوسروں کے رُجحانوں کا وہ منظّم سیٹ ہے جسے فرد قبول کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ فٹ بال کھیل رہا ہے تو وہ "generalized other process" کے ذریعے دوسروں کے رُجحانوں کا پتہ چلا لیتا ہے اور ان کی توقعات کو سمجھ جاتا ہے جسے وہ پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا وہ "Me" کا جواب دیتا ہے۔

ذات کا وہ عنصر جو جبلت کی ترجمانی کرتا ہے وہ "I" کہلاتا ہے جس کی وجہ سے منفرد خصوصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور افراد میں مزاجوں کے فرق کی بنا پر امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ جن افراد میں انفرادیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی تعمیری اور تخریبی سرگرمیوں کا اظہار بعینہٖ اسی طریقے پر کرتے ہیں جس طریقے پر کہ وہ سماجیت کے دور سے گزر چکے ہوتے ہیں۔

میڈ کے خیالات کسی قدر پیچیدہ ضرور ہیں لیکن توجہ سے پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماجیت کے طریقے میں ڈھلا ہوا فرد دو ذاتوں یا "Selves" کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں سے ایک کا انحصار فرد کی حیاتیاتی خصوصیتوں پر ہوتا ہے اور دوسرے کا انحصار دوسروں کے رُجحانوں پر جسے وہ اپنے رول کے جزو کی حیثیت سے قبول کر لیتا ہے۔ اکثر جبلت پر مبنی افعال اور سماجی رول میں تصادم ہوتا ہے لیکن جب فرد مکمل طور پر سماجیت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے تو وہ "I" اور "Me" کو اس کاملیت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے افعال یا خیالوں میں کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا بلکہ اس کی شخصیت مکمل نظر آتی ہے۔

4 : فرائڈ کا نظریۂ لاشعور، تحتِ شعور اور شعور :

FREUD'S THEORY OF ID, EGO & SUPER-EGO

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud-1856-1930) جس کا شمار جرمنی کے مشہور ماہرِ نفسیات میں ہوتا ہے وہ سماجیت کے طریق کے سلسلے میں انسانی ذہن کی تین کیفیتوں کو پیش کرتا ہے۔

1 : لاشعور Un Conscious – ID

2 : تحتِ شعور Pre-Conscious – EGO

3 : شعور Conscious – SUPER-EGO

یہ تین ذہنی کیفیتیں انسان کے مختلف افعال و اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہیں مثال کے طور پر جب انسان پر لاشعوری کیفیت طاری رہتی ہے تو وہ جبلی اور حیوانی خواہشات کا شکار رہتا ہے۔ اسی لیے اس حالت میں انسان سے جو بھی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اس وقت اسے یہ احساس نہیں رہتا کہ آیا وہ فرد اور سماج کے لیے مفید ہیں یا مضر۔ اس قسم کی بحث سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس وقت "لذ" یا لاشعوری کیفیت طاری ہونے کی وجہ سے انسان کے پیشِ نظر کوئی اقدار یا Values نہیں ہوتے۔ نہ وہ اچھائی اور برائی میں امتیاز کر سکتا ہے۔ نہ وہ اخلاق اور مذہبی اصولوں کی بحث میں پڑتا ہے۔ وہ صرف حیاتیاتی عضویے کی حیثیت سے بنیادی جبلتوں (basic impulses) کو تسکین پہنچانا چاہتا ہے۔

تحتِ شعور یا Ego انسانی ذہن کی وہ کیفیت ہے جو سماجی اقدار اور معیارات کی وجہ سے تشکیل پاتی ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں فرد اپنی اندرونی خواہشات اور خارجی دنیا یعنی دوسرے افراد کی توقعات دونوں کا اندازہ لگا کر اس طرح کی حرکت سے باز رہنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے شرمندگی نہ ہو۔ اس لیے لاشعوری حالت میں جب کہ انسان اصولِ لذت یا Pleasure-principle کا شکار رہتا ہے وہ تحتِ شعور میں حقیقت (reality) سے متصادم ہو کر ایسے افعال و اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے جو اس کے لیے کامیابی اور تحفظ کے ضامن ہوتے ہیں۔ غرض اس کیفیت میں انسان وحشی جذبوں کا شکار نہیں رہتا بلکہ عقل اور استدلال سے کام لے کر برتاؤ کے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو دوسروں سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ وہ لاشعوری

کیفیت سے پیدا ہونے والی خواہشات اور جذبات کو جن میں خطرات سے دوچار ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے ان پر اس طرح قابو پانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی تکمیل سماج کے مروّجہ طریقوں کے مطابق ہوسکے، لیکن تمام صورتوں میں ego کامیاب نہیں رہتا جب جبلتوں اور خواہشوں کا انسان پر غلبہ رہتا ہے تو عقل اور استدلال ناکام ہوجاتے ہیں اس لیے جب تک لاشعور اور تحتِ شعور میں کوئی تصادم نہیں رہتا اس وقت تک انسان کی زندگی ایک حال پر چلتی رہتی ہے لیکن جب انسان لاشعوری کیفیت سے مغلوب ہوجاتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان مختلف مختلف قسم کی ذہنی اور نفسی اُلجھنوں کا شکار ہوکر عصبی امراض میں مُبتلا ہوجاتا ہے۔ غرض تحتِ شعور کیفیت بڑے نازک مراحل سے گزرتی ہے۔ ایک طرف حیوانی خواہشیں، دوسری طرف زندگی کی حقیقتیں اور تیسری طرف شعوری حالت یعنی Super ego۔

ذہنی کیفیت کی تیسری صورت شعوری ہے جسے فرائڈ نے "Super-ego" کہا ہے۔ Super-ego کی حیثیت ایک محتسب کی ہوتی ہے۔ جب بھی انسان کی جبلی خواہشات اور حیوانی جذبے سماجی اقدار سے ٹکراتے ہیں تو ذہن کی یہ کیفیت اس کو روکنے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ اس کے نزدیک سماجی اقدار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔

جب افراد سماجیت کے طریق میں ڈھلتے ہیں تو سماجیت کی ہر ایجنسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ متعلقہ افراد میں سماج کے پسندیدہ طریقوں کو منتقل کیا جائے اس لیے بچپن میں Super-ego کا رول والدین ادا کرتے ہیں جب کہ وہ بچّے کی ناواجبی خواہشوں پر تحدیدیں عائد کرتے ہیں اُنھیں ترغیب دھمکیوں کے ذریعے ایسے افعال سے روکتے ہیں جو ناپسندیدہ ہوں۔

اس طرح ماں باپ سماج کے جن معیاروں کی پابندی کر والتے ہیں انھیں بچّہ شروع میں نادانستہ طور پر اختیار کر لیتا ہے لیکن بعد میں وہ اس کی ذات کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ اس طرح والدین یا دوسرے افراد جو بچّے کی تربیت اور تعلیم میں حصّہ لیتے ہیں وہ دراصل اس تمدّن کی نمایندگی کرتے ہیں جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمدّن کی نمایندگی Super-ego کرتا ہے۔

غرض ذہن کی یہ تین کیفیتیں لاشعور، تحتِ شعور اور شعور اس طرح انسانی فکر پر اثر انداز ہوتی ہے کہ ہر فرد اپنے افعال و اعمال کے ان طریقوں کا پتہ چلا لیتا ہے جو سماج کے افراد کی توقعات کو پوری کرتی ہوں۔

اکتساب اور تقلید۔ انعام سزا:

LEARNING AND IMITATION— REWARD & PUNISHMENT.

سماجیت کے طریق کا دار و مدار اکتساب پر ہے اور اکتساب سے مراد سماجی طور طریقوں کو سیکھنے سے ہے:

"A learning experience takes place when an individual, seeking satisfaction of a need, finds a way of obtaining this satisfaction by modifying his behavior. Every experience that changes a person's subsequent behavior is a learning experience."

یعنی "سیکھنے کا تجربہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ فرد کسی ضرورت کی تکمیل کے لیے اپنے برتاؤ میں تبدیلی کرکے اس ضرورت کو پورا کرنے کا کوئی راستہ نکالتا ہے۔ ہر وہ تجربہ جو مابعد افعال میں تبدیلی لائے اکتسابی تجربہ ہے۔"

(1) ارتسال کا جواب — *responding to communication*
(2) انسانی مثالوں پر عمل کرنا — *following human examples*
(3) تجربے اور غلطیوں سے سیکھنا — *using trial and error*
(4) سوچ وچار — *thinking*

مثال کے طور پر اگر ہم ٹائپ سیکھنا چاہتے ہیں تو اس پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھیں گے جس سے تحریری ارتسال (Written Communication) حاصل ہوگا۔ اگر دوسروں کو ٹائپ کرتے دیکھ کر سیکھ جائیں تو اس کی نوعیت تقلیدی ہوگی یعنی کوئی مثال سامنے ہے اس کی نقل کی جارہی ہے۔ ان دونوں موقعوں کی عدم موجودگی میں تجربے اور غلطیوں سے بھی بعض سیکھ جاتے ہیں۔ ایسے کئی لوگ ہیں جو روزانہ استعمال میں آنے والی کئی چیزوں کو درست کرتے ہیں ان کے اوزار کھولتے اور جوڑتے ہیں جس کی بنا پر "hit & miss process" پر عمل کرکے خود بخود سیکھ جاتے ہیں۔ اور بالآخر ان کی غور و فکر، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ان کی رہبر بنتی ہے۔

اکتساب کا طریق پیدائش کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اور تمام عمر جاری رہتا ہے گو اس کی نوعیت میں فرق آجاتا ہے۔ اس طریق کا تعلق راست ہمارے اس تمدن سے ہوتا ہے جس میں ہم پیدا ہونے اور زندگی گزارتے ہیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ کسی قسم کا تمدن نہیں لاتا بلکہ اس کی زندگی سراسر دوسروں کی نگہداشت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جو سماجیت کے طریق سے گزر چکے ہوتے ہیں اور جنھیں اس کا اندازہ رہتا ہے کہ بچے کی ضرورتیں کیا ہیں اور انھیں کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے؟ سماجیت کی ابتدائی ایجنسی خاندان ہے اور خاندان میں بالخصوص ماں کے ذریعے بچے پسندیدہ افعال و اعمال کے ان گنت نمونے سیکھتے ہیں۔ انھیں "غلط" اور "صحیح" کا کوئی احساس نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ جب ان کے ہاتھ سے کوئی قیمتی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو انھیں مطلق ندامت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب وہ کوئی گرم چیز کو چھو لیتے ہیں تو چیخ پڑتے ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ گرم چیز ایک ہیج Stimulus ہے اور ان کا چیخ پڑنا ایک جواب یا response ہے۔ تجربوں کے اس دوران میں ماں ان کو حالات کی نوعیت سے واقف کراتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچوں کو ماں کی ضرورت صرف ان کی احتیاجوں کو پورا کرتے وقت ہی نہیں ہوتی بلکہ ماں کا وجود ہی ان کے لیے اطمینان کا باعث ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو انتہائی محفوظ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں ذاتی تجربوں سے بھی مفید اور مضرت رساں اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔

عمر کے ایک درجے پر پہنچ کر بچوں کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کے طور طریقوں کے بارے میں ان سے وابستہ افراد کی خاص رائے ہوتی ہے۔ ان کی بعض حرکتوں کو سراہا جاتا ہے۔ ان سے پیار و محبت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ انھیں مختلف ترغیبیں دی جاتی ہیں۔ غرض انھیں چھوٹے بڑے انعام ملتے رہتے ہیں لیکن بعض حرکتیں ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ انھیں ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ انھیں روکا ٹوکا جاتا ہے اور نہ ماننے کی صورت میں سزا دی جاتی ہے۔ چونکہ بچوں کو اپنی ماں یا دوسرے افرادِ خاندان کی خوشنودی منظور ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے طور طریقوں میں ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں۔

بچے اپنے اطراف و اکناف میں اپنے بڑوں اور ساتھیوں کو جس قسم کا عمل کرتے دیکھتے ہیں اس کی نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر والدین عبادت کر رہے ہوں تو وہ بھی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں اگر وہ باغ میں کام کر رہے ہوں تو خود بھی ان کی طرح کام

کرنے لگتے ہیں۔ ان پسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے بڑے بہت خوش ہوتے ہیں اور انھیں خوش کرنے اور آیندہ اسی قسم کے پسندیدہ طریقوں کو اپنانے کے لیے مختلف ترغیبیں دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف جب بچے کسی ناپسندیدہ طریقوں کی تقلید کرتے ہیں انھیں اس حرکت سے روکنے کے لیے ان کی خواہشوں کو رد کر دیا جاتا ہے۔ دھمکی دی جاتی ہے اور سزا دی جاتی ہے۔

جب بچہ اسکول جانے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف نئے مضامین پڑھنا اور لکھنا سیکھتا ہے بلکہ اُستادوں اور ہم جماعتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ تعاونِ عمل، میل جول، پابندئ وقت، ایمانداری، تمیز و شائستگی، آدابِ گفتگو، طرزِ برتاؤ کے طریقے بھی سیکھتا ہے۔

غرض اکتساب کے طریق کی وجہ سے افعال و اعمال کے نمونوں میں تبدیلی اور تصیح ہوتی رہتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر فرد اکتساب اور سماجیت کے طریق سے گزرتا ہے تو اس کے اثرات مختلف کیوں ہوتے ہیں؟ ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ حیاتیاتی اختلافات کی وجہ سے اکتساب کا طریق کسی کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور کسی کے لیے مشکل۔ کسی کے لیے خوشگوار اور کسی کے لیے ناخوشگوار۔ اس طریق سے بالخصوص ایسے لوگ محروم رہتے ہیں جو اپنی دماغی کمزوریوں کی بنا پر اچھائی اور بُرائی میں فرق ہی نہیں کر سکتے۔

دوسری وجہ سماجی ماحول سے علاحدگی ہے۔ وہ تمام بدنصیب ہستیاں جو اپنے والدین کے کیفرِ کردار کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی پرورش عام طور پر تنہائی میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے انھیں وہ صحت مندانہ سماجی ماحول نہیں ملتا جو شخصیت کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ کنگسلے ڈیوس (Kingsley Devis) نے اس سلسلے میں ان بچوں کی مثالیں دی ہیں جو ناجائز تعلقات کا نتیجہ ہونے کی بنا پر انھیں سماجی ربط سے محروم کر دیا گیا۔

غرض سماجیت وہ طریق ہے جس میں رسمی اور غیر رسمی طور پر اکتساب کا عمل جاری رہتا ہے۔ رسمی طور پر تمدنی ورثے کی منتقلی پڑھائی لکھائی کے ذریعے عمل میں آتی ہے جو اسکول، کالج، مذہبی اور دوسرے ادارے اپنے ذمے لیتے ہیں۔ غیر رسمی تعلیم و تربیت کا سب سے موثر ذریعہ خاندان ہے جو زندگی کے اہم دَور میں جب کہ مختلف نقش بچوں کے لفس اور ذہن پر ترتب ہوتے ہیں۔ زبان سیکھنے اور پسندیدہ طریقوں کو اپنانے کی بُنیاد گھر کے افراد ہی ڈالتے ہیں۔ عُمر میں جس طرح بتدریج

اضافہ ہوتا ہے اسی طرح تمدن کی منتقلی کے لیے براہ راست ذریعوں یا ایجنسیوں کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ افراد اپنے اطراف و اکناف میں جن پسندیدہ چیزوں کو دیکھتے ہیں انھیں اپناتے ہیں۔

جب سماجیات کی ایجنسیوں اور متعلقہ فرد میں مکمل ہم آہنگی رہتی ہے تو اکتساب کا طریق آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جب سماجیت کی ایجنسیاں متعلقہ فرد کی نفسی اور ذہنی کیفیتوں کو سمجھے بغیر اس کو مخصوص افعال و اعمال کی پابندی کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

سماجیت کے طریق کی وجہ سے افراد کے دماغ پر پرانے افعال و اعمال کے نقش باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے تجربوں کی بنا پر خود ہی اپنے طور طریقوں کی قدر بندی کر لیتے ہیں کہ کون سا فعل خراج تحسین حاصل کر سکتا ہے اور کون سا باعث ندامت ہو سکتا ہے؟ اس احساس کی بنا پر ان کے افعالی نمونوں میں تبدیلی نظر آتی ہے۔

فہرست کتب جن سے اس باب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا

1- Lundberg, C.A. & Schrag e.& Larsen, O.N. "Sociology." Harper, N.Y. 1963. p.171.

2- Mitchell, D.L. "Sociology." Monarch press. N.Y. p.14.

3- Gillin & Gillin: "Cultural Sociology." p.643.

4- Fichter, J.H. "Sociology." Chicago press. 1957. p.22.

5- Dressler: p.48.

6- Bogardus: p.419.

7- Gillin & Gillin. p.649.

8- Martindale: p.344.

9- Dressler: p.181.

10- Gillin & Gillin. 650.

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

آریہ سماج کی تاریخ

مصنف:۔
لالہ لاجپت رائے
صفحات: 252
قیمت: -/60 روپے

اسلامی سماج

مصنف:۔
ریوبن لیوی
صفحات: 701
قیمت: -/237 روپے

مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظامِ حکومت

مصنف:۔
ہارون خاں شیروانی
صفحات: 290
قیمت: -/82 روپے

جدید سیاسی فکر

مؤلف:۔
ڈاکٹر سید انوار الحق حقی
صفحات: 305
قیمت: -/120 روپے

ابتدائی سماجیات

مصنف:۔
ڈاکٹر محمد عبد القادر عمادی
صفحات: 163
قیمت: -/43 روپے

ہندوستانی مسلمان

مصنف:۔
محمد مجیب
صفحات: 812
قیمت: -/258 روپے

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066

Designed & Printed by Fahad Computers : 9810111854